انڈو یجوئل لینڈ

انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

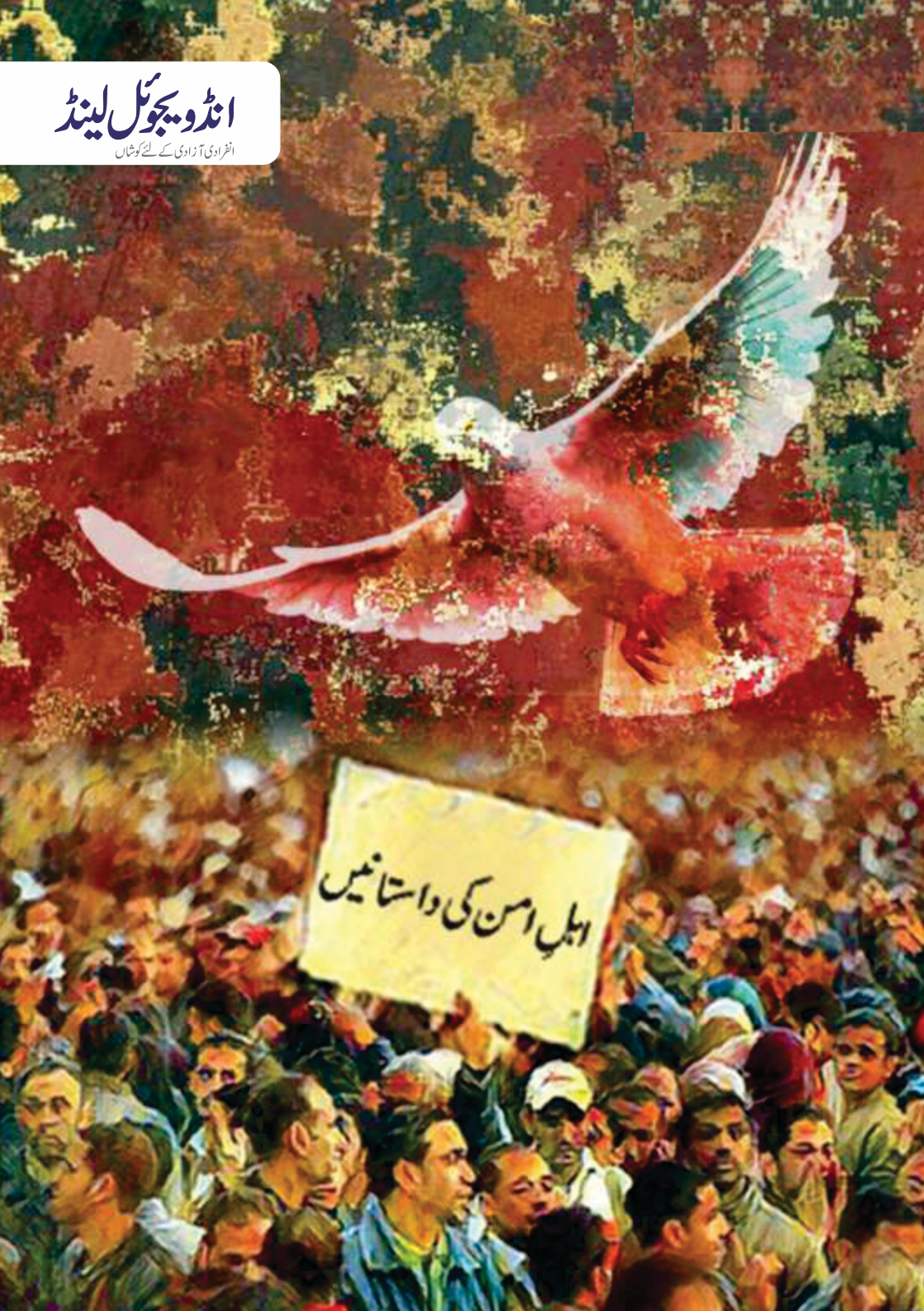

فہرست

تلاشِ منزل ____ ۱
زندگی جہدِ مسلسل ____ ۴
ٹانک کی ماں ____ ۱۱
ناہموار راہیں ____ ۱۷
پہلا قدم میرا کیوں نہیں؟ ____ ۲۳
کر بھلا، ہو بھلا ____ ۲۶
زمین سے رشتہ نبھا رہے ہیں ____ ۲۹
میرے ارادے: میری پہچان ____ ۳۴
ناکردہ گناہ معاف ____ ۳۷
میری ہمت: میرے ساتھی ____ ۴۰
خودی ____ ۴۲
کامیابی کا گیت ____ ۴۵
رازِ حیات ____ ۴۸

پبلیشر	کوارڈینیشن	ڈیزائین	کارٹونسٹ	لکھاری
انڈ ویجوئل لینڈ	سید فہد الحسن	عدیل امجد ڈاٹ لائینز	اختر شاہ (شاتون)	سندس سیدہ مشہود علی

پس منظر

ہم بہت سی معاشرتی بیماریوں کو اپنے اردگرد دیکھتے ہیں لیکن بہت سے لوگ ان معاشرتی بیماریوں کے سدِ باب کے لیے مثبت کام کر رہے ہیں۔ ہر فرد ملک کا قیمتی سرمایہ ہے، عموماً ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ رہنے والے افراد کا ملک کی ترقی اور خوشحالی میں کیا کردار ہے۔ جبکہ ہمارے آس پاس بے شمار ایسے لوگ بستے ہیں جو اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے سرگرم ہیں۔ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان نے ایک حقیر کوشش کی ہے کہ ہمارے درمیان بسنے والے ایسے افراد کا تعارف کچھ نئے انداز میں پیش کیا جائے جو ہمارے آس پاس بستے ہیں اور امن کے فروغ اور قیام میں اپنی ثوابدید کے مطابق حصہ ڈال رہے ہیں ان کی زندگی کی کہانیاں لوگوں تک پہنچائی جائیں۔

ہماری اس کاوش کا مقصد آپکو ان لوگوں سے متعارف کروانا ہے جو ہمارے آس پاس ہی بستے ہیں لیکن آجکل کے اس مصروفیت کے دور میں ہمیں موقع نہیں ملا کہ ان کے بارے میں جانیں یا ان کے کیے گئے اقدامات سے آگاہ ہوں۔ اس کتاب کے ذریعے میں ہم نے پشاور، ہنگو، کوئٹہ، بنوں، ٹانک اور ڈیرہ اسماعیل خان کے افراد کی داستانیں آپکے سامنے پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ ان کی داستانیں جنہوں نے امن کے فروغ میں اپنا حصہ ڈالا اور ڈال رہے ہیں۔ آیئے آدھی ملاقات کیجئے ہمسائیوں سے اور رسالہ پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی قیمتی آراء سے آگاہ کریں کہ آپکو اپنے ہی علاقے کے لوگوں کے بارے میں جان کر کیسا محسوس ہوا۔

آپ ہمیں ان لوگوں کی داستانیں بھیج سکتے ہیں جو آپکے علاقے میں کسی مثبت کام کرنے یا کروانے میں سرگرم ہیں۔ اگر آپ نے اپنے علاقے میں کسی اچھے کام کی بنیاد ڈالی ہے، اگر آپکو کبھی تشدد کا سامنا کرنا پڑا ہو یا آپ کسی غلط کام سے بھاگ کر کسی مثبت کام کی جانب آئے ہیں اس صورت میں بھی آپ اپنی کہانی بھی ہمیں ارسال کر سکتے ہیں۔

آپنی قیمتی آراء سے آگاہ کرنے اور مزید داستانیں بھیجنے کے لیئے آپ info@individualland.com پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

تلاش منزل

وحیدہ ظفر کی کہانی

بنوں میں چند جگہوں پر ابھی بھی تانگے کی سواری ہو رہی ہے۔ ۲۰۱۷ء میں بنوں کے بازار سے گزرنے والے تانگے کی اگلی نشست پر ایک عورت جس نے پیروں میں جاگرز پہن رکھے ہیں اور مردانہ انداز میں سلی ہوئی بوسکی کی شلوار قمیض زیب تن کر رکھی ہے۔ سر پر سجی شال کے کناروں سے جھانکتے سنہرے بال، سمندر کے پانی جیسی سبز آنکھیں جن میں چمک نمایاں ہے۔ دنیا اور لوگ کیا کہیں گے ایسے کسی بھی تاثر سے پاک چہرہ بہت دلکش اور حسین لگ رہا ہے۔ بنوں کے مقامی ہوٹل کے سامنے تانگہ رکا تو خوش آمدید کہنے کے لیے لوگ آگے بڑھے۔

میزبانوں نے وحیدہ ظفر کا تعارف کروایا" آج ہمارے ساتھ بنّوں کے ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھنے والی وحیدہ ظفر موجود ہیں، جن کے پُرکھوں کو خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ وحیدہ نے پشاور یونیورسٹی سے بین الاقوامی تعلقات میں ماسٹرز کیا اور مختلف قومی اور بین الاقوامی اداروں میں کام کر چکی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وحیدہ اپنے بارے میں مزید بتائیں"۔ وحیدہ کو مائیک دیا گیا تو انہوں نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا" میں نے عورت ہونے کے ناطے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے لیکن کبھی پیچھے نہیں ہٹی نہ کبھی ہٹوں گی۔ ۱۹۹۷ء میں پہلی مرتبہ پشاور میں خواتین کی میٹنگ بھی میں نے منعقد کروائی جس میں ۱۲۰ خواتین نے برقعوں میں ملبوس ہو کر شرکت کی۔ وحیدہ بات کرتے کرتے جیسے ماضی میں چلی گئیں۔ انہوں نے اپنے بچپن کا قصہ سنانا شروع کیا۔ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ ایک رئیس خاندان جن کو ہر طرح کی سہولیات میسر ہوں ان کو بھلا کن مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے؟ اور جن کاموں کا میں نے بتایا وہ کرنا بھی آسان ہوں گے لیکن میرے بچپن میں ہی ایسے کئی واقعات ہوئے جنکی وجہ سے آج تک ہم خاندانی دشمنیاں بھگت رہے ہیں۔

دو نوجوان بچے شکار والی بندق سے گھر کے سامنے لگے درخت پر بیٹھے پرندوں کا شکار کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک وحیدہ کا بھائی اور دوسرا کزن ہے۔ "اب میری باری ہے" وحیدہ کے کزن نے کہا" نہیں ابھی میں دوبارہ نشانہ لگاؤں گا" بھائی نے بندوق دینے سے انکار کیا۔ بندوق کھینچا تانی میں نہ جانے کیسے چل گئی اور وحیدہ کے کزن کی ٹانگ میں گولی لگی۔ ڈاکٹروں کی غفلت سے ٹانگ کاٹنا پڑی اور وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ پایا۔ اس ایک غلطی کی پاداش وہ ابھی تک بھگت رہی ہیں۔ انہوں نے مسکراتے چہرے کے ساتھ کہا" خاندان میں دشمنیاں چلنے لگیں۔ وہ

ہمارے بندے مارتے ہم انکے بندے مار دیتے۔ میرے بھائی کو ۳۴ سالہ پرانے نوکر کو پیسے دے کر مروایا گیا جب کہ ۴۰ دن کے بھتیجے کے کان میں پگھلتا سیسہ ڈال کے مار دیا گیا۔ میں نے خاندانی جھگڑوں کی وہ صورتحال برداشت کی جس میں عام زندگی گزارنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی امن اور صلح کی کوشش کرتی رہی"

وحیدہ نے نم آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ کہا میں نے پوری کوشش کی کہ اس لڑائی کو بڑھنے سے روکا جائے۔ اسی لیے میں خواتین کا جرگہ لے کر صلح کی نیت سے مخالفین کے گھر گئی لیکن انہوں نے دشمنی ختم نہیں کی۔ میرے دوسرے بھائی پر ۲۰ سال تک مخالف پارٹی کی طرف سے مقدمہ چلا بھائی مقدمے بھگتتا رہا اور میں اسکے بچوں کو بھی پڑھاتی رہی۔ تفرقہ اور دشمنی کو بڑھنے سے روکنے کے لیے مخالفین کو نوکریاں دلوائیں، ہر طرح سے اُن کی مدد کی اور جو اختلافات تھے ان کو جرگوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی، دوسری طرف بھائی اور بھتیجوں کو شہر سے باہر رہنے کا مشورہ دیا تا کہ دشمنی کی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔

وحیدہ کی زندگی کی کہانی سکرین پر ڈاکیومنٹری کی مانند میں چل رہی تھی۔ وحیدہ نے ۲۰۰۱ء میں بنّوں میں ایک نجی اسکول کی بنیاد رکھی اور بطور پرنسپل اسکول کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ دفتر میں بیٹھی ابھی کاغذات دیکھ رہی تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی وحیدہ نے فون اٹھا کر سلام کیا۔ سلام کا جواب تو نہیں ملا لیکن دوسری جانب سے آنے والی آواز میں کسی نے دھمکی دی۔ "اگر اپنی جان عزیز ہے تو یہ اسکول بند کر دو" وحیدہ نے وجہ پوچھی" کیونکہ یہ کافروں کا اسکول ہے اسکو ہم یہاں نہیں چلنے دیں گے "وحیدہ نے فون بند کر دیا۔ یہ معمول بن گیا، کبھی کوئی دھمکی والا خط کبھی کال موصول ہوتی لیکن وہ اپنے مقصد میں ڈٹی رہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ بنوں کے بچے تعلیم میں پیچھے نہ رہیں اس کے لیے وہ ثابت قدم رہیں۔

ایک صبح وحیدہ اسکول آ رہی تھیں کہ دور سے دیکھا گستاخانہ مواد کے خلاف جلوس نکلا ہوا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں نے احتجاجی طور پہ اسکول پہ پتھر اور ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ وہ اسکول تک نہیں پہنچ سکتی تھیں لہذا انہوں نے وہاں سے تھانے کا رخ کیا۔ تھانے کے اسٹیشن ہاؤس آفیسر کو بتایا کہ اسکول میں بچے موجود ہیں ان کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسکے بعد ڈپٹی انسپکٹر جنرل صاحب کے دفتر پہنچیں۔ "جی محترمہ میں آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ڈپٹی انسپکٹر جنرل صاحب نے پوچھا۔ وحیدہ نے بتایا" میں بنوں میں نجی اسکول میں پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہی ہوں مجھے بہت دھمکیاں موصول ہوئی ہیں کہ میں اسکول بند کر دوں میں پیچھے نہیں ہٹی، لیکن اب صورتحال سنگین ہوتی جا رہی ہے۔ گستاخانہ مواد کے خلاف نکلنے والے جلوس نے اسکول پر پتھراؤ کیا ہے۔ میں آپ سے التماس کرتی ہوں کہ نہ صرف ہمارے اسکول کو بلکہ تمام غیر مسلمانوں کے مشنری اسکول اور ہسپتال کو گھیرے میں لیں تا کہ جلوس وہاں پہنچ کے

تباہی نہ کر سکے۔ کیونکہ وہاں پر جو لوگ ہیں وہ بے قصور ہیں"۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل صاحب نے انکو یقین دہانی کروائی کہ وہ تحفظ کو یقینی بنائیں گے۔

اگلے دن اسکول میں اسمبلی کے بعد وحیدہ نے اسٹیج پر آ کر اعلان کیا" ابھی کوئی بچہ کلاس میں نہیں جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سب بھی گستاخانہ مواد کے خلاف پُر امن احتجاج کریں لیکن ایسے نہیں جیسے باہر کھڑے لوگ کر رہے ہیں۔ ہم انکو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہاں کے بچے نبی پاک ﷺ کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔ اساتذہ سے میری گزارش ہے کہ بچوں کے ساتھ مل کر چارٹ پر امن کے پیغامات لکھیں اور ہم اسکول کے باہر کھڑی ہو کر غلط عمل کے خلاف یکجہتی کا پیغام دیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ طلبہ کو پر امن احتجاج کے نعرے سکھائیں جن میں کسی قسم کے اشتعال انگیز الفاظ کا استعمال نہ ہو بلکہ حضور ﷺ کی شان میں پیغام دیا جا رہا ہو"۔ بچوں کو اساتذہ کے ساتھ تیاری کروانے کے بعد وحیدہ سب سے آگے کھڑی ہو گئیں اور اسکول کے سامنے احتجاج کرنے والوں کو کہا" ہم احتجاج میں آپکے ساتھ ہیں لیکن میں آپکو بتانا چاہتی ہوں کہ ہم بھی آپ جیسے ہیں اگر آپکو احتجاج کرنا ہے تو پریس کلب کے سامنے کریں تا کہ میڈیا یہ پیغام آگے پہنچا سکے"۔

وقت گزرتا رہا وحیدہ مختلف اداروں کے ساتھ نوکریاں کرتی رہیں، انہوں نے بنوں میں ہی ہر چھ سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر فیڈرل اسکول بھی کھولے اور کچھ مزید کام کیا۔ ۲۰۱۳ء میں دوبارہ اسی نجی اسکول میں بطور پرنسپل منتخب ہوئیں جہاں پہلے تھیں۔ ایک دن خبر آئی کہ پشاور میں آرمی پبلک اسکول پر حملہ ہو گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد اسکول کو دھمکیاں موصول ہونے لگیں۔ اسکول میں تقریباً روز پولیس آتی اور وحیدہ کو بھیس بدل کر آنے کو کہا جاتا۔ انہوں نے اسکول میں اپنے دفتر کی جگہ تبدیل کر کے لائبریری کی جگہ اپنا دفتر بنا لیا جو کہ اسکول کے عقبی حصے سے متصل تھا تا کہ ہر طرف نظر رہے۔ جب اسکول کے حفاظتی عملے کو کسی حملے یا آفت کی صورت میں سامنا کرنے کے لیے خاص ٹریننگ دینے کا موقع آیا تو میں نے نہ صرف حفاظتی عملے بلکہ اساتذہ اور طلباء کو بھی خود کے دفاع کے لیے تربیت دلوائی۔ ایک دن چند لوگوں نے اسکول کو گھیرے میں لے لیا اور وہ دیوار پھلانگ کر اندر آنا چاہتے تھے وحیدہ نے چوکیدار سے کہہ کر دروازہ بند کروایا۔" اگر کوئی بھی اندر آنے کی کوشش کرے تو اسکے ماتھے پر گولی مارنا اور اگر گولی چلاتے ہوئے تمہارے ہاتھ کانپ جائیں تو مجھے بتاؤ میرا نشانہ خطا نہیں ہوتا میں خود گولی ماروں گی لیکن یہ بچے جو اسکول میں تعلیم حاصل کرنے آئیں ہیں میری ذمہ داری ہیں۔ ان کی حفاظت مجھ پر فرض ہے" وحیدہ کی اب تک کی زندگی پر بنی ڈاکیومنٹری کا اختتام ہو رہا ہے لیکن انکی فروغ امن کی کاوش ابھی جاری ہے۔

زندگی جہدِ مسلسل
فرحت صدیق کی کہانی

ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک متوسط گھرانے کی ایک بچی شدید گرمی میں کندھے پر بستہ لٹکائے تھکی ہاری گھر کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے۔صحن میں نلکے کے ساتھ بیٹھی برتن مانجتی ماں آواز دیتی ہے۔ "فرحت شکر ہے تم آ گئیں جلدی سے اپنی بہن کو کھانا کھلا دو صبح اسکول جانے سے پہلے تم نے ناشتہ کروایا تھا ابھی تک وہ بھوکی ہے۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی کہ اسکے کپڑے بھی تبدیل کرتی۔تم کھانا کھلا کر اسکے کپڑے بھی تبدیل کر دینا"۔فرحت نے صحن کے وسط میں پڑی چارپائی پر لیٹے ہلنے جلنے سے قاصر وجود پر ایک نظر ڈالی۔اپنے تھکے وجود کو سمیٹتی اپنی ماں کی جانب بڑھی،ان سے کھانے کی پلیٹ لے کر اپنی معذور بہن کی چارپائی پر بیٹھ کر اسکو کھانا کھلانے لگ گئی۔ساتھ والی چارپائی پر بھی ایسی ہی لاچار حالت میں ایک بھائی لیٹا ہوا ہے ماں اب اسکو کھانا کھلانے میں مصروف ہو چکی ہے۔

اگلے دن اسکول میں استاد صاحب نے کاپی چیک کرتے ہوئے فرحت سے پوچھا" کاپی پر پانی کیسے گرا ہے؟تم اپنی کاپی کتابوں کا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔اس پر سے حروف مٹ گئے ہیں امتحان میں کیسے سبق یاد کرو گی؟"فرحت سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔اسکے ذہن میں کل کا نقشہ گھوم گیا۔فرحت نے معذور بہن کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھانا کھایا اور اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی تبھی اسکے والد نے اسکی والدہ کو آواز دے کر پوچھا تھا" کل میں نے حلوے بنانے کا سامان دینے جانا ہے کیا سامان تیار ہو گیا ہے؟"فرحت کی والدہ جلدی سے اٹھیں اور فرحت کو کہا" جلدی سے میرا ہاتھ بٹا دو تم گندم کو پانی لگا کر چھت پر ڈال کر لائی تھی اس پر کپڑا ڈال آؤ اور

پہلے والی گندم سے جو پنیری چنی ہے آ کر اسکو بنانے میں میری مدد کرو"۔کام کاج کے دوران اسکے کپڑے گیلے ہو گئے اور جب لکھنے بیٹھی تو اس کی کاپی کا ایک صفحہ گیلا ہو گیا۔

زندگی کے ماہ وسال اسی نشیب وفراز میں گزرتے گئے۔فرحت نے بچپن سے لڑکپن میں کب قدم رکھا پتہ ہی نہ چلا۔وہ وقت آ گیا کہ گھر میں فرحت کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔خاندان والوں کی ناراضگی کے باوجود فرحت کی شادی خاندان سے باہر کر دی گئی۔فرحت کو لگتا تھا کہ اب حالات بہتر ہو جائیں گے۔انہوں نے اپنی شادی سے پہلے کی زندگی اپنے معذور بہن بھائی کو سنبھالتے، ماں کے ساتھ حلوہ بنانے والوں کے لیے کام کر کے روزی کماتے گزاری تھی۔شادی کے بعد ان مشکل حالات سے جان چھوٹ جائے گی۔لیکن اب فرحت زندگی کے ایسے دور سے گزر رہی تھی جہاں اس کے لیے نئی مشکلات تھیں۔فرحت محلے کے بچوں کو قرآن پاک پڑھا رہی تھیں۔ کمرے سے اسکے شوہر نے آواز دے کر پوچھا" میرے کپڑے استری کیے ہیں؟ اس نے شوہر کو کہا" میں ابھی استری کر دیتی ہوں تب تک آپ کھانا کھا لیں"۔شوہر نے جواباً کہا" تمہیں کل کہا تھا کہ صحن صاف کر دینا وہ بھی نہیں کیا۔تمہیں گھر سنبھالنا بھی مجھے ہی سکھانا پڑے گا؟ میں جو کام کہوں وہ وقت پر کیا کرو"۔فرحت نے ایک نظر صحن میں قرآن پڑھتے بچوں پر ڈالی کہ محلے کے بچوں کے سامنے زیادہ ڈانٹ نہ پڑ جائے۔انہوں نے جلدی سے کہا" اچھا آئندہ احتیاط کروں گی"۔

فرحت کے گھر اولاد نہیں تھی اس لیے وہ خاموشی سے سخت رویہ بھی برداشت کر لیتی تھیں۔انکو ایسا لگتا تھا کہ انکا شوہر اولاد نہ ہونے کا طعنہ نہیں دیتا تو یہ بہت بڑی غنیمت ہے۔شوہر کا کوئی کام وقت پر نہ ہو تو فرحت کانپ جاتی تھیں۔

ایک دن فرحت کا شوہر گھر آیا اور فرحت کو کہا" میں چاہتا ہو کہ تم الیکشن میں کھڑی ہو جاؤ۔فرحت نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا" مجھے کون ووٹ دے گا؟ شوہر نے کہا" میں چاہتا ہوں تم الیکشن لڑو، زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ ووٹ کم ملیں گے؟ کوئی بات نہیں ہم کوشش تو کر سکتے ہیں"۔فرحت اب شوہر کی چارپائی کے پاس کھڑی

تھیں۔ "ہم غریب لوگ ہیں الیکشن میں تو بہت سے پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں"۔ شوہر نے کہا "اس کے لیے پارٹی انتظامات کر لے گی تم ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ فرحت کو ذہنی طور پر تیار ہونے کا کہہ کر باہر کی جانب جا رہا تھا لیکن فرحت یہ سوچ رہی تھیں کہ اگر وہ گھر کے کام وقت پر نہیں کر سکے گی اور الیکشن میں مصروف ہو جائے گی تو اسکے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟"

الیکشن کی تیاریوں اور انتظامات کا پتہ ہی نہیں چلا، وہ دن آ ہی گیا جسکا انتظار تھا یعنی کہ الیکشن کا دن جو کہ نہایت مصروف گزرا۔ فرحت کے گھر کے دروازے پر ڈھول بج رہا ہے، شوہر گھر میں مٹھائی کا ڈبہ لے کر داخل ہوتا ہے۔ "مبارک ہو میں کونسلر کا شوہر بن گیا ہوں"۔ فرحت خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات لیے دیکھ رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شوہر نے الیکشن لڑنے کے لیے بہت ہمت بندھائی لیکن اس سے پہلے اسکا برتاؤ فرحت کے ساتھ اتنی محبت والا کبھی نہ تھا۔ سیاست میں آ کر وہ لوگوں سے قریب ہوتی چلی گئیں۔ محرم کے دس دن جو کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں سکیورٹی کے حوالے سے اہم ہوتے ہیں ان دنوں میں فرحت ڈیوٹی کر رہی تھیں کہ ایک شخص پاس آیا اور پوچھا کیا آپ اہل تشیع ہیں؟ فرحت نے مسکرا کر جواب دیا "میں اہل سنت سے ہوں لیکن میں اس معاشرے کی ذمہ دار شہری ہوں اس لیے میں ہر سال اپنا فرض سمجھ کر یہ ڈیوٹی دیتی ہوں، جلوس میں آنے والے لوگوں کی تلاشی وغیرہ لیتی ہوں، مجھے معلوم ہے میں جہاں کھڑی ہوں وہاں میں محفوظ نہیں ہوں لیکن میں اپنے لوگوں کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہوں"۔ فرحت کو ڈیوٹی کے دوران ایک خاتون نے کہا "ہمیں آپ پر فخر ہے آپ نے فرقہ سے بالاتر ہو کر امن کے فروغ کو فرض اور ذمہ داری سمجھ کر نبھایا ہے"۔

۲۵ دسمبر کی شام فرحت ہمسایوں کے گھر گئیں۔ دروازے پر آنے والی خاتون سے کہا "میرے ساتھ چلو کیک لے جا کر مبارکباد دے دیتے ہیں کمیونٹی سنٹر میں کرسمس کا پروگرام منعقد کروایا گیا ہے"۔ خاتون نے کہا "میں لیاقت کے ابا سے پوچھ کر آتی ہوں۔ ہمارے ساتھ اور کون جا رہا ہے؟"۔ "میں نے آٹھ دس لوگوں کو کہلوایا ہے دیکھو اب ان میں سے کون آتا ہے"۔ کمیونٹی سنٹر میں رنگ برنگے ملبوسات پہنے لوگوں نے فرحت کو

خوش آمدید کہا۔ایک شخص انکو اسٹیج پر لے گیا۔اسٹیج پر بیٹھے اسپیکر نے کہا مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ ہمارے تہوار میں ہماری خوشیوں میں شریک ہونے آئیں ہیں۔ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔فرحت نے ان سے مائیک لے کر کہا" میں چاہتی ہوں کو تمام مذاہب کے لوگوں کے بیچ میں ہم آہنگی ہو اس لیئے کرسمس پر بھی جاتی ہوں اور ہولی میں بھی شریک ہوتی ہوں۔لیکن یہ صرف خوشی اور غمی کے تہوار میں شریک ہونے تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ اگر آپ کا کوئی مسئلہ ہو تو محلے کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اگر حل نہ ہو تو مختلف فورمز پر لے جاتی ہوں۔میں آپکو یقین سے کہتی ہوں کہ جہاں کہیں بھی آپکو میری مدد کی ضرورت ہوگی مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پائیں گے۔میں نے آج تک کوئی کام بھی کسی مذہب،مسلک اور کسی اور بنیاد پر نہیں کروایا بلکہ میں انسانیت کی بنیاد پر انسان ہونے کے ناطے ہر انسان کے کام آنا چاہتی ہوں"۔تقریب کے اختتام تک فرحت وہیں موجود تھی۔

اگلے دن فرحت کو کسی شادی میں جانا تھا۔"جلدی کرو فرحت شادی ہال بند ہو جائے گا" فرحت کا شوہر دروازے کے پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔اتنے میں فرحت دروازے پر آ گئیں" چلیں ایک کال آ گئی تھی کسی کا کوئی خاص مسئلہ تھا اسکو یقین دلوایا ہے کہ کل میں دس بجے ان کے گھر انکا مسئلہ حل کروانے آجاؤں گی"۔

شوہر نے دروازے پر تالا لگاتے ہوئے کہا"لوگوں کے مسائل کبھی ختم نہیں ہوں گے اور ہم شادی میں جانے کے لیے لیٹ ہو گئے ہیں"۔ابھی گھر کو تالا لگا کر وہ دو چار قدم آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے آتا ایک نوجوان فرحت کے پاس آ کر بولا" شکر ہے فرحت باجی آپ یہاں ہی مل گئیں ہیں سلمہ چوک پر اپنے آپ کو آگ لگا رہی ہے۔آپ جلدی میرے ساتھ چلیں"۔انہوں نے شوہر کی جانب دیکھا اس سے پہلے وہ کچھ کہتے فرحت نوجوان کے ساتھ جا رہی تھیں۔وہ اس جگہ پہنچی جہاں سلمہ خودسوزی کرنے کی کوشش میں تھی اور تمام لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔اس نے آگے بڑھ کر سلمہ کے ہاتھ سے ماچس کی تیلی لی اور اس کو کسی نوجوان سے چادر لے کر اوڑھائی۔" تمہیں معلوم ہے تم کیا کر رہی ہو؟ خودسوزی حرام ہے،میرے ساتھ گھر چلو"۔وہ سلمہ کو ساتھ لے

کر اپنے گھر کی جانب چل پڑی۔ جاتے ہوئے سلمہ کے سسرال والے جو وہیں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے انکو کہا "میں تمہاری بہو کو اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔ پہلے میں اس سے بات کر لوں پھر اسکے گھر والوں کو بٹھا کر بات ہوگی۔ گھر پہنچ کر اس نے سلمہ کو کپڑے دیے "یہ لو کپڑے تبدیل کر لو اتنی دیر میں تمارے لیے چائے بناتی ہوں۔ کوئی بیوقوفی مت کرنا اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے کہو تا کہ اسکو حل کیا جا سکے بجائے اس کے کہ تم غلط راستہ اختیار کرو۔"

اگلے دن فرحت نے لڑکی کے گھر والوں کو فون کیا "میں سلمہ کو لے کر اسکے سسرال جا رہی ہوں اور میں چاہتی ہوں سب کی موجودگی میں فیصلہ ہو آپ لوگ سلمہ کے سسرال آ جائیں۔ سلمہ کے سسرال پہنچ کر سب کے سامنے انہوں نے سلمہ سے کہا "سب سے پہلے میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے انتہائی قدم کیوں اٹھایا؟" سلمہ نے رونا شروع کر دیا۔ فرحت نے سلمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "دیکھو سلمہ رونے سے مسائل حل نہیں ہوں گے، تمہیں وجہ بتانی ہوگی"۔ سلمہ نے ہمت جمع کی اور کہنا شروع کیا "آپ فیاض (سلمہ کا شوہر) سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ وہ مجھے کیوں مارتا ہے؟ روز روز مار کھانے سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں"۔ اب کی بار فرحت فیاض سے متوجہ تھیں "تم اپنی بیوی کو کیوں مارتے ہو؟" فیاض نے کہا "یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے"۔ فرحت نے جواب دیا "تمہارے گھر کا نہیں یہ قانون کا معاملہ ہے۔ اگر سلمہ کو کچھ ہوا یا اسکو مار پیٹ کی تو یہ تم پر پرچہ کروا سکتی ہے۔ اگر تم پھر بھی باز نہیں آئے تو میں تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو تھانے لے جاؤں گی اور اسکے ذمہ دار تم ہو گے"۔ پھر وہ سلمہ کے سسر اور ساس کی جانب مڑی "بہن اسکو اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھائیں۔ مار پیٹ سے دشمنیاں بڑھتی بڑھتی خاندانوں تک پہنچ جاتی ہیں"۔ وہاں پر دونوں خاندانوں اور لڑکے لڑکی کا راضی نامہ کروا کر وہ اپنے گھر کی جانب چل پڑیں۔ اپنے گھر میں اونچ نیچ کا سامنا کرتی فرحت آج لوگوں کے گھر کے مسائل حل کروا رہی تھیں۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ بھی انہی عورتوں میں سے ہیں جو گھر کی چار دیواری میں بھی کبھی کبھی خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں۔

دونوں میاں بیوی بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے ۔شوہر کے موبائل پر فون آیا۔"اچھا"۔۔۔ "کب؟"۔۔" کس کے ساتھ ہورہی ہے؟"۔۔ "مبارک ہو"۔۔۔۔۔۔"ہاں ہم کل آئیں گے"۔بات کر کے نہوں نے فرحت کو بتایا" شکیلہ آپا کی بیٹی کا نکاح ہے"۔فرحت نے خوشی سے جواب دیا"اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے ہم کل ہی مبارک دینے جائیں گے بلکہ ان سے پوچھنا تھا اگر کوئی کام ہو تو ہمیں بتادیں"۔اس کے شوہر نے کہا" کل جائیں گے تو کام کا پوچھ لیں گے"۔فرحت نے پوچھا"لڑکا کون ہے کیا کرتا ہے؟"شوہر نے کہا "بلال سے ہورہی ہے"۔فرحت حیرت کے مارے بیڈ سے اچھل پڑیں"بلال سے کیسے ہوسکتی ہے؟"شوہر نے حیرت سے سوال کیا"لڑکے میں کیا برائی ہے؟تم کیوں اتنی حیران ہورہی ہو؟"فرحت نے کہا"بلال کم عمر ہے اور قانونی طور پر اس کا نکاح ابھی نہیں ہوسکتا"۔شوہر نے کہا"یہ باتیں تم لوگوں سے کیا کرو گھر کا مسئلہ ہے یہ گھر والوں سے یہ بات کروگی تو ہم دونوں کے لیے مسائل ہوں گے"۔" آپ کچھ بھی کہہ لیں میں پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں، یہ گھر کا مسئلہ ہے اسی لیے کہہ رہی ہوں۔میں لوگوں کے لیے کام کرتی رہوں اور اپنے گھر میں یہ حالات ہوں تو یہ چراغ تلے اندھیرے والی بات ہوگی"۔فرحت یہ کہہ کر سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

اگلے دن دونوں میاں بیوی مٹھائی کا ڈبہ لے کر رشتیداروں کے گھر گئے۔مبارک دینے کے بعد فرحت نے کہا" مجھے بیٹی سے ملواؤ میں اسکو مبارک دینا چاہتی ہوں۔وہ کیا سوچے گی کہ آنٹی آئی ہے اور مجھے ملی بھی نہیں"۔وہ مبارک دینے کے بہانے لڑکی کے کمرے میں گئیں۔مبارک دینے کے بعد لڑکی سے پوچھا" کیا تمہاری پسند کی شادی ہے؟"لڑکی نے حیرت سے سوال کیا" آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"۔"اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر تمہاری پسند نہیں تو تمہارے لیے ہم کوئی اور لڑکا ڈھونڈ سکتے ہیں۔اگر پسند ہے تو میں تمہیں اور لڑکے کو سمجھانا چاہوں گی"۔لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے کہا" کیا سمجھانا چاہیں گی میں کچھ سمجھی نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں"۔ "بیٹی لڑکا بالغ نہیں اس لیے یہ شادی نہ ہو تو بہتر ہے"۔اتنے میں لڑکی کی ماں کمرے میں داخل ہوئیں"فرحت تم میری بیٹی سے کیسی باتیں کر رہی ہو،ہم شادی طے کر رہے ہیں اور تم اسکو ورغلا رہی ہو"۔فرحت نے کہا"میں ورغلا نہیں رہی لڑکا بالغ نہیں ہے تمہاری بیٹی کو رشتوں کی کمی نہیں پھر پہلے ہی رشتے پر شادی کر دینا اتنا ضروری نہیں ہے۔

اگر یہاں ہی رشتہ کرنا ہے تو میں لڑکے والوں سے بھی بات کروں گی منگنی ہو جائے اور لڑکا بالغ ہو جائے تب شادی ہو"۔ دونوں خاندانوں سے بات کرنے اور بے شمار ناراضگیوں کے باوجود فرحت بضد تھیں کہ وہ یہ شادی نہیں ہونے دیں گی۔ پھر انہوں نے لڑکے والوں کو سمجھایا، صرف یہ ہی نہیں بلکہ لڑکی کے لیے دوسرا رشتہ ڈھونڈا اور اسکی شادی کی تیاریاں کروانا بھی فرحت نے ذمہ داری سمجھ کر قبول کیا۔

فرحت کھانا کھانے کے لیے بیٹھیں ہی تھیں کہ دروازہ کھٹکا۔ شوہر نے دروازہ کھولا تو چاچا کرم دین سامنے کھڑا تھا۔ "چاچا اس وقت کیسے آنا ہوا خیریت ہے؟"۔ "خیر نہیں ہے، میرے بیٹے کو پولیس لے گئی ہے میں فرحت بیٹی کو کہنے آیا ہوں کہ میرے ساتھ تھانے چلیں"۔ فرحت چاچا کرم دین کے ساتھ تھانے پہنچ گئیں "انسپکٹر صاحب اس بچے کو آپ نے کیوں بند کر رکھا ہے؟" فرحت کے پوچھنے پر انسپکٹر صاحب نے بتایا "موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی ہے اور یہ اسکی خلاف ورزی کر رہے تھے"۔ فرحت نے کہا "ہمارا چھوٹا سا شہر ہے لوگ ایک دوسرے سے مدد لے لیتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو اب بچے قانون کی خلاف ورزی نہیں کریں گے لیکن قوانین بھی تو غریب کی ہی کمر توڑ رہے ہیں"۔ انسپکٹر صاحب نے کہا "آپ کے کہنے پر بچوں کو چھوڑ دیتا ہوں لیکن آئندہ احتیاط کریں"۔

فرحت دیگچی میں چمچ ہلاتے ہوئے شوہر سے باتیں کر رہیں تھیں۔ "لوگوں کے کام آ کر مجھے ذہنی سکون ملتا ہے۔ کونسلر بن کر میں اپنے لوگوں کے اتنے قریب ہو گئیں ہوں۔ اب تحصیل اور ضلع کی نشست پر خدمات فراہم کرنا چاہتی ہوں "۔ فرحت کی زندگی میں بھی بہت سے مسائل اور پریشانیاں ہیں لیکن وہ لوگوں کے کام آ کر اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کرتی ہیں کہ جو مشکلات انہوں نے دیکھی ہیں دوسرے ان مشکلات سے دوچار نہ ہوں۔

ٹانک کی ماں

رضیہ اجمل کی کہانی

رضیہ اجمل نے ٹانک میں رہتے ہوئے تعلیم حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب ان علاقوں میں خواتین کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بنیادی تعلیم ڈیرہ اسماعیل خان سے حاصل کرنے کے بعد پشاور سے تعلیم مکمل کر کے ہیلتھ ورکر کی سند لی۔ رضیہ نے اس دور میں دور دراز علاقوں میں کام کیا جب زیادہ ہیلتھ ورکر نہیں ہوتیں تھیں۔ رضیہ کا کہنا ہے کہ "مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ ٹانک اور اسکے آس پاس کے علاقوں میں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جن کی ماؤں کی زچگی کے کیس میں نے کیے ہیں۔ وہ بچے جو میرے ہاتھوں دنیا میں آئے ان میں سے آج کوئی طبیب، جج تو کوئی کسی اور اعلیٰ عہدے پر ہے۔ سبھی مجھے جانتے ہیں اور پیار کرتے ہیں"۔

رضیہ کھانا پکا رہیں تھیں کہ دروازہ کھٹکا۔ دروازہ کھولنے پر سامنے کھڑے شخص نے کہا "جلدی چلیں آپکے بھائی کی طبیعت خراب ہے"۔ رضیہ نے برقعہ اوڑھا اور بھاگتی ہوئی ماں باپ کے گھر پہنچیں۔ بھائی کی خراب حالت دیکھ کر رضیہ کا رنگ اڑ گیا۔ جیسے ہی رضیہ نے نبض پر ہاتھ رکھا پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ گئیں کہ اسکو ہسپتال لے جانے میں بہت دیر ہو چکی ہے۔ یہ قیامت کی گھڑی تھی ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، چھوٹے بچے چھوڑ کر دنیا کو خیر باد کہہ گیا تھا۔ رضیہ اپنے ماں باپ اور بھابھی کو اپنے گھر لے آئی یتیم بچوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔

رضیہ اور اسکے بھائی کی بچیاں بڑی ہو گئیں تھیں انکو کالج میں داخل کروانے کا وقت آیا۔ اس دور میں ٹانک میں لڑکیوں کا کالج نہیں تھا۔ لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے ڈیرہ اسماعیل خان جانا پڑتا تھا۔ زیادہ تر لوگ دوری اور مسافت

کی وجہ سے بچیوں کو کالج نہیں بھیجتے تھے۔ رضیہ نے اپنی بچیوں کو کالج میں داخل کروایا۔ جب وہ اپنی بچیوں کو ٹانک سے ڈیرہ اسماعیل خان میں کالج چھوڑنے اور لینے جاتیں تو محلے کی بھی چند لڑکیوں کو ساتھ لے جانا اور لانا اپنی ذمہ داری سمجھ کر قبول کیا۔ اس دور میں چند لڑکیاں تھیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتیں تھیں۔ رضیہ کو معلوم تھا اگر وہ انکو ڈیرہ لانے لے جانے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتیں تو ان لڑکیوں کے لیے تعلیم حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ رضیہ اپنے محلے کے لوگوں کے کام کرتیں لوگ ان پر اعتبار کرتے تھے۔

رات کے تین بج رہے تھے کہ رضیہ کے گھر کا دروازہ کھٹکا۔ نوکر نے دروازہ کھولا اتنے میں رضیہ کے شوہر باہر آ گئے۔ خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ قریبی گاؤں میں زچگی کا کیس ہے بیگم صاحبہ کو ایک عورت اور مرد لینے آئے ہیں۔ رضیہ بھی آوازیں سن کر باہر آ چکی تھیں۔ عورت دروازے کے پاس کھڑی تھی رضیہ کو سامنے دیکھ کر آگے بڑھی۔ میں آپکی منت کرتی ہوں ہمارے ساتھ چلیں ایمرجنسی ہے۔ رضیہ برقہ پہن کر اپنے ڈرائیور کو ساتھ لیے

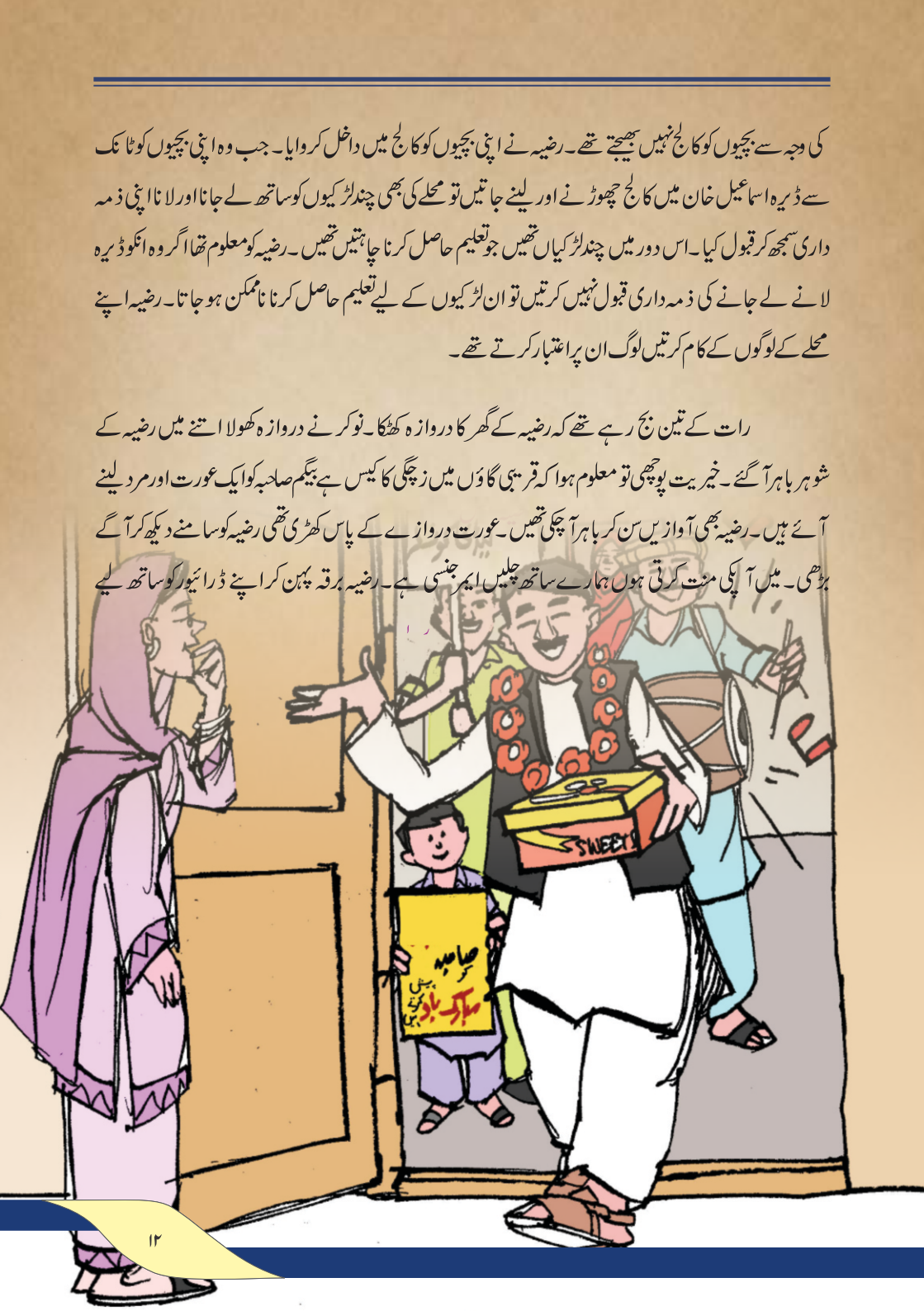

انکے ساتھ چل پڑیں۔شاید رضیہ ابھی راستے میں ہی تھیں کہ وہ عورت دم توڑ چکی تھی، جیسے ہی رضیہ نے وہاں پہنچ کر اسکو دیکھا معذرت اور افسوس کے لیے بھی الفاظ کم پڑ گئے تھے۔انکے گھر میں ایک کہرام مچ گیا اور رضیہ وہاں سے واپس آ گئی۔واپسی کے راستے ڈرائیور سے کوئی بات نہ کی اور گھر آنے پر خاموشی سے بستر پر لیٹ کر کروٹیں لیتی رہیں۔انکو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت بڑا گناہ ہو گیا ہو۔نہ جانے پھر ذہن میں کیا آیا مسکرا کر سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ایسے لگتا تھا جیسے کچھ کرنے کا ارادہ باندھ لیا ہو۔

اگلی صبح رضیہ شوہر کے آگے پراٹھے اور چائے کا کپ رکھتے ہوئے بولیں "میں سڑک والی زمین کا سودا کرنے جا رہی ہوں"۔شوہر نے حیرت سے پوچھا" اتنی زمین کا کیا کرو گی؟"۔"میں چاہتی ہوں کہ وہاں ہسپتال بناؤں۔رات کو سہولیات کے فقدان کی وجہ سے ایک عورت چل بسی اور اسکا بچہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی مر گیا۔ایسے واقعات مزید نہ ہوں اس لیے ہمیں ٹانک میں ہسپتال بنانے کی ضرورت ہے"۔شوہر نے کہا" ارادہ تو تمہارا نیک ہے لیکن یہ کام اتنی آسانی سے کیسے ہوگا"۔رضیہ نے کہا"میں نے ارادہ کر لیا ہے اب اگر اللہ کو منظور ہوا یہ کام میرے ہاتھوں ہونا ہوا تو کوئی نہیں روک سکتا"۔

رضیہ کے شوہر نے کہا" جیسے تمہاری مرضی لیکن میں اس حوالے سے تمہارا زیادہ ساتھ نہیں دے سکوں گا کیونکہ میں شہر میں نہیں ہوتا سوچ لو یہ کام اتنا آسان نہیں ہے"۔زمین کا سودا ہو گیا تھا۔ہسپتال کا نقشہ بننے، سے لے کر تعمیر تک کے مراحل تل پہنچتے پتہ بھی نہ چلا۔رضیہ ہسپتال کے باہر کھڑی مزدوروں سے کام کروا رہی تھیں۔انکو جلدی تھی کہ ہسپتال مکمل ہو جائے، وقت نکال کر خود ہر روز یہاں آنا اور کام کروانا انکا شوق تھا۔مزدوروں کو دیہاڑی دے کر گاڑی میں بیٹھیں۔ڈرائیور کو کہا" بازار چلو میں بچوں کے لیے کپڑے خریدلوں" ۔رضیہ اپنے اور بھائی کے بچوں اور بچیوں کو ایک جیسے کپڑے پہناتی تھیں جس کے لیے وہ زمانہ اور مردانہ ایک جیسے تھان لے آتیں تھیں۔بازار سے کپڑا خرید کر گاڑی میں رکھوایا۔"تم یہ گاڑی میں رکھو میں سبزی اور پھل لے کر آتی ہوں"۔ وہ مین بازار کے چوک میں کھڑی ریڑھی سے سبزی خرید رہی تھی۔اچانک چند لوگ آئے رضیہ کے ماتھے پر پستول رکھ

کر کہا" آواز مت نکالنا، جلدی سے گاڑی میں بیٹھو" اس سے پہلے کہ رضیہ کچھ کہتی وہ رضیہ کو گھسیٹ کر گاڑی میں بٹھا چکے تھے۔ رضیہ کا ڈرائیور دور کھڑا تھا وہ بھاگتا ہوا آیا لیکن رضیہ کو اغوا کرنے والے گاڑی بھگا کر لے گئے۔ جلدی سے گھر گیا اور گھر پہنچ کر اس نے سب بتایا۔ رضیہ کے شوہر اور بچوں نے جگہ جگہ فون کیے، معلوم کرنے کی کوشش بھی کی کہ شاید کوئی انکو ایمرجنسی کیس کے لیے لے گیا ہو۔ یہ جانتے تھے سب کہ انکو پستول دکھا اغوا کیا گیا ہے لیکن یقین نہیں آ رہا تھا۔

دوسری جانب رضیہ کو اغوا کر کے شمالی وزیرستان لے گئے اور کمرے میں بند کر دیا۔ اغوا کرنے والوں نے چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا پھر بھی رضیہ نے پہچان لیا مگر خوف کے مارے کچھ نہیں بول پا رہیں تھیں۔ اغوا کاروں میں سے ایک شخص نے کہا" ہمیں معلوم ہے تمہارے پاس بہت پیسہ ہے اگر اپنی جان عزیز ہے تو منہ مانگی رقم ادا کرنی ہوگی"۔ رضیہ نے کہا" تمہیں کتنے پیسے چاہیں؟" اغوا کار نے کہا پچیس لاکھ کا انتظام کرواؤ ہم تھوڑی دیر میں تمہاری بات گھر والوں سے کروائیں گے انکو ہماری مانگ بتا دینا"۔ رضیہ نے کہا" تم بہت زیادہ رقم مانگ رہے ہو، میرے پاس اتنے زیادہ پیسے نہیں ہیں اور چار دن میں میرے گھر والے انتظام کہاں سے کریں گے؟"۔ اغوا کرنے والے نے کہا" فالتو باتیں نہیں کرو، نہ پیسے کم ہوں گے نہ دن زیادہ ہوں گے۔ جیسا کہتے ہیں ویسا کرو ورنہ کاٹ کے پھینک دیں گے"۔ رضیہ نے ہمت جمع کر کے کہا" میرے پاس جو پیسہ تھا میں نے ہسپتال پر لگا دیا ہے اب میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں معلوم ہے تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ہم تمہیں چار دن کا وقت دے رہے ہیں۔ بچوں کو کہو ماں چاہیئے تو بھیک مانگیں اور رقم جمع کریں"۔ یہ کہہ کر اغوا کار کمرے کو باہر سے تالا لگا کر چلے گئے۔ رضیہ کے گھر قیامت برپا تھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کیا ہوا اور رضیہ کہاں ہیں۔ رضیہ کا شوہر بھی شہر سے پہنچ چکا تھا، گھر میں لوگوں کا رش تھا۔ ہر کوئی آتا اور دعا کرتا" وہ ہماری ماں ہیں اس مشکل گھڑی میں ہم آپکے ساتھ ہیں"۔ رضیہ بہن ہے ہماری اسکے لیے ہم کچھ بھی کریں گے"۔ یہ وہ جملے تھے جو رضیہ کے گھر والوں کی ہمت بندھا رہے تھے۔ مساجد میں رضیہ کی واپسی کی دعائیں کروائیں گئیں۔ محلے کے گھروں میں قرآن پاک کے ختم کروائے جا رہے تھے۔ پھر ایک دن کے بعد اغوا کاروں نے فون کیا اور رقم کا مطالبہ کیا۔ پریشانی کم ہوئی تھی کہ

رضیہ خیریت سے ہیں اور تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔

اب سب سے برا مرحلہ رقم جمع کرنے کا تھا جو کہ ایسے طے ہوا کہ محلے کے لوگوں نے جہیز، علاج اور تعلیم کے لیے جمع کی گئی رقم رضیہ کے شوہر کو دی۔ "آپ یہ تاوان کی رقم رکھیں رضیہ صرف آپکے بچوں کی نہیں بلکہ پورے ٹانک کی ماں ہیں۔ ہم اپنی ماں کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں"۔

تاوان کی رقم دے کر رضیہ واپس آئیں تو سب مٹھائیاں لے کر آرہے تھے۔ رضیہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ واقعی سب کی ماں ہیں۔ رات کو جب سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تو رضیہ نے اپنے شوہر سے کہا" میرے لوگوں نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ انکا قرض کیسے اتارا جائے؟"۔

دونوں نے مسئلے کے حل کے لیے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ رضیہ کا خواب اسکا ہسپتال بیچ دیا جائے۔ وہ ہسپتال جو رضیہ اپنے لوگوں کے لیے خون پسینے کی کمائی اور خون پسینہ ایک کر کے مزدوروں کے سر پر گرمیوں سردیوں کھڑے رہ کر بنوا رہی تھی افتتاح سے پہلے ہی بک گیا تا کہ قرض اتارے جائیں۔ رضیہ کو دوبارہ ہسپتال بنانے کا موقع نہ ملا۔ لیکن لوگوں کی فلاح کے لیے کام کرنے کا ارادہ مضبوط ہوتا گیا۔ انہوں نے مختلف اداروں کے ساتھ کام کیا۔ چند لوگوں نے رضیہ کو کہا" آپ لوگوں کے کام آتی ہیں تو آپ الیکشن میں کیوں نہیں کھڑی ہوتیں؟"۔ "تم سب میرے بچے ہو مجھے تو یقین ہے اگر میں لیکشن لڑوں تو جیت جاؤں گی۔ بلکہ بلا مقابلہ جیت جاؤں گی"۔ رضیہ نے اس یقین کے ساتھ بلدیاتی الیکشن میں حصہ لیا اور ضلعی کونسلر منتخب ہوئیں۔ "میرے ٹانک کے لوگوں کو اسکول، کالج اور ہسپتال پہنچنے میں تکلیف ہوتی ہے میں چاہتی ہوں کہ سڑکوں کے لیے مختص کیے بجٹ کو جلد لگایا جائے"۔ رضیہ نے میٹنگ میں نہ صرف اپنے علاقے کے لوگوں کی سہولیات اور بجٹ کے حوالے سے بات کی بلکہ خود یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

ایک دن رضیہ سے کسی میٹنگ میں بیرون ملک سے آئے لوگوں نے سوال کیا" آپکے علاقے کے لوگ

کہاں سے پانی پیتے ہیں"۔رضیہ نے کہا" کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جہاں سے میرے لوگ پانی پیتے ہیں میں آپکو وہ جگہ دیکھادوں؟"۔ان لوگوں کی رضامندی پر رضیہ انکو ساتھ لے کر ایک تالاب پر لے گئیں جہاں جانور بھی پانی پی رہے تھے اور عورتیں اور بچے اپنی پانی کی پالٹیاں بھر کر لے جارہے تھے۔وہ لوگ بہت حیران ہوئے رضیہ نے انہیں کہا" اگر آپ ہمارے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں فلٹر پلانٹ لگوادیں۔تاکہ یہ بھی صاف پانی کا ذائقہ چکھ سکیں"۔

اگلے دن رضیہ ایک زچہ و بچہ سنٹر کا افتتاح کرنے کے بعد اپنے گھر کے صحن میں خواتین کو لیے جمع تھیں۔" ہم جلد ہی سلائی سینٹر کھولیں گے تاکہ وہ خواتین جو پڑھی لکھی نہیں ہیں اور ضرورت مند بھی ہیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے خودمختار ہوسکیں۔لیکن جو عورتیں لیڈی ہیلتھ ورکر بننا چاہتی ہیں انکو بھی ہم تربیت دلوائیں گے۔میں مصالحتی کمیٹی کی ممبر ہوں اور خواتین کے نان ونفقہ کے مسئلے دیکھ رہی ہوں اس لیے میرا ماننا ہے کہ اگر حالات بہتر بنانے ہیں تو خواتین کو بے جا کی پابندیوں سے آزاد کرنا ہوگا،انہیں اچھا ماحول دینا ہوگا اور تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔تب ہی وہ اپنا بہترین حصہ فلاح کے لیے دے سکیں گی۔میری مثال آپکے سامنے ہے اگر میں پڑھی لکھی نہ ہوتی تو نہ ہی اپنے بچوں کی اچھی پرورش کر پاتی اور نہ اپنے علاقے کی فلاح کے لیے کوئی اہم کردار ادا کر پاتی۔اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اگر ایک رضیہ اس دنیا سے جائے تو اسکی جگہ اس سے بھی اچھا کام کرنے لے لیے دوسری کئی عورتیں موجود ہوں"۔رضیہ بوڑھی ہوچکی ہیں لیکن انہوں نے اپنے بچوں اور ٹانک کی عورتوں کے لیے خاص طور پر کام کیا ہے۔رضیہ کے بچے چاہتے ہیں کہ اب وہ آرام کریں لیکن رضیہ کا کہنا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہیں اپنے لوگوں کی ایک آواز پر انکے لیے کھڑی ہوجائیں گی اور انکی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گی۔

ناہموار راہیں

رانیا تمکین زیدی کی کہانی

رانیا کا تعلق ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ وہ بنوں کے کالج میں پڑھتی ہیں اور ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ رانیا کلاس میں بیٹھی تھیں کہ اطلاع ملی رانیا کی خالہ ڈیرہ اسماعیل خان سے لینے کے لیے آئیں ہیں۔ رانیا کا نہ کوئی بھائی تھا اور نہ ہی اسکے ماموں تھے اس کے والد صاحب کے علاوہ اگر کوئی انکا خیال رکھتا تھا وہ وہ انکی خالہ تھیں۔ جو مردوں کی طرح انکے ساتھ ہر جگہ کھڑی ہوتیں تھیں۔ رانیا حیران تھیں کہ اسکی خالہ بغیر طلاع دیے اچانک اسکو لینے کیوں آگئیں ہیں۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی پرنسپل کے دفتر کی جانب بڑھیں جہاں اسکی خالہ اسکا انتظار کر رہیں تھیں۔ رانیا دعا کر رہی تھی کہ اسکے والدین خیریت سے ہوں کیونکہ اہل تشیع کو ڈیرہ اسماعیل خان میں ہر روز دھمکیاں ملتی رہتیں تھیں۔ مسلک کی بنیاد پر قتل اور فسادات سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگتی جب پرنسپل کے دفتر میں پہنچی تو اسکی خالہ اسکے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگیں۔ رانیا انکے آنسو اور خاموشی سے مزید گھبرا گئیں۔ "خالہ کیا ہوا ہے؟ امی ابو خیریت سے ہیں؟"۔ خالہ نے رانیا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا" تمہارے کزن امجد کو کسی نے قتل کر دیا۔ اور کسی نے تمہارے سب کزنز کو ایک ساتھ میسج کیا کہ ہسپتال سے باڈی لے جائیں۔ سب لڑکے ہسپتال پہنچ گئے ابھی وہ ایمبولینس میں میت رکھ رہے تھے کہ ایک دھماکہ ہو گیا اور ہمارا خاندان لٹ گیا۔ میرے خاندان کے بائیس لڑکے شہید ہو گئے۔ تمہارے ابو کو ڈر تھا کہ اگر ہم تمہیں فون پر اطلاع دیں تو تم کیسے آؤ گی اسی لیے میں خود تمہیں لینے آئی ہوں۔ تمہارے والد جنازے کے انتظامات کر رہے ہیں"۔ گھر پہنچے پر رانیا نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک ہی گھر کی بائیس جوان لاشیں تھیں جو ایک صف میں لگی ہوئیں تھیں۔ نماز جنازہ کے لیے صف بنانے کا سنا تھا جنازے کی صفیں نہ سنیں تھیں نہ دیکھیں تھی۔ ایک خاندان کے بائیس جوان ایک ہی دھماکے میں شہید کر دیے

گئے۔کیا قیامت کا منظر اسی کو کہتے ہیں؟ جب جنازہ اٹھانے والے کندھے کم ہوں اور جنازے زیادہ ہوں۔

یہ رانیا کے خاندان کے لیے یہ ایک ایسا جھٹکا تھا جس کے بعد تین صورتیں سامنے تھیں۔ایک یہ کہ بدلہ کی آگ میں اس زمین کو خون سے رنگ دینے کی جانب چلنے لگتے، دوسرا یہ کہ خوف کے سائے تلے ڈر کر باقی زندگی گزار دی جاتی اور تیسری صورت یہ تھی کہ اس صورتحال سے بچنے اس زمین کو مزید فسادات سے بچانے کے لیے کچھ کیا جاتا۔ رانیا بہت حساس تھیں وہ سماج میں موجود نفرتیں، شکایات، ناہمواریاں اور تلخیاں کم کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہتیں تھیں۔

رانیا نے پڑھائی مکمل کرنے کے بعد سماجی کام کرنے کا بیڑا اٹھالیا اس نے مختلف اداروں کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔اسکا کام کسی کو سڑکیں بنوا کے دینا یا پانی فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ لوگوں کو جمع کر کے امن کی فروغ کی بات کرنا تھا۔ یہ کام اس لیے بھی مشکل تھا کیونکہ لوگ پیسے لے کر تو کوئی کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے لیکن ان کو کہا جائے کہ بغیر پیسے لیے ایک گھنٹہ نکال کر کسی میٹنگ میں جانا ہے تو لوگ انکار کر دیتے تھے۔ رانیا نے گھر گھر جا کر لوگوں خاص طور پر خواتین کو راضی کیا کہ وہ جو کام کرنے جا رہی ہے اس میں ان کا فائدہ ہے۔ایک گھر میں بیٹھی وہ

عورتوں کو سمجھا رہی تھی۔ "ہم سب کا فائدہ اس لیے ہے کہ اگر ہمارے علاقے میں امن ہوگا تو ہم بغیر کسی خطرے کے کہیں بھی جا سکیں گے۔ ہمیں خوف نہیں ہوگا ہم اور ہمارے بچے محفوظ ہوں گے۔" ایک عورت نے کہا" تمہاری بات تو درست ہے لیکن ہمارے گھر والوں کو کون سمجھائے گا کہ ہمیں میٹنگ میں تمہارے ساتھ جانے دیں؟"۔ رانیا نے ایک گہرا سانس لیا" یہ ذمہ داری بھی میری ہوئی میں ان کو منالوں گی"۔

اگلے دن رانیا لوگوں کو میٹنگ میں اپنی زندگی کی کہانی بتا رہی تھی تا کہ انکو یہ محسوس نہ ہو کہ رانیا کو کوئی پریشانی نہیں ہے اس لے وہ امن کی بات کر سکتی ہے۔ "ہمارا خاندان بدامنی اور فرقہ واریت کا نشانہ بنا، ہمارے خاندان کے بائیس لوگ ایک ہی دھماکے میں شہید ہو گئے۔ آج بھی ڈر و خوف کے سائے ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں لیکن پھر بھی میں آپکے سامنے موجود ہوں۔ میرے ساتھ کام کرنے والے، پڑھنے والے اور ہمسائے مختلف مذاہب اور مسالک کے لوگ ہیں۔ جب ہم کمیونٹی میں اکھٹے رہ سکتے ہیں تو آج آپ سب لوگوں کو ایک چھت کے نیچے اس میٹنگ کے لیے جمع کرنے میں مجھے مشکل کیوں پیش آئی؟ کیا کسی کے پاس میری بات کا جواب ہے؟ میٹنگ میں مختلف مسالک اور مذاہب کے لوگ مرد و خواتین موجود تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی جواب نہیں دے رہا تھا۔ رانیا نے پوچھا" آپ لوگ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں؟"۔ سب نے کہا" ہاں ہوتے ہیں"۔ کیا کبھی آپ نے یہ پوچھ کر کبھی کسی کی مدد کی ہے کہ کس مسلک سے تعلق ہے؟" لوگوں نے کہا" ایسا نہیں ہے ہم مستحق کی مدد کرتے ہیں چاہے وہ کسی بھی مذہب یا مسلک سے ہو"۔ رانیا نے کہا" میں آپ کو یہ ہی کہنا چاہتی ہوں کہ ہم ساتھ کھاتے پیتے ہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں، دکھ تکلیف میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلک کے نام پر اتنے بڑے فسادات ہو جاتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی تیسری قوت ہمیں آپس میں لڑوا رہی ہے؟ یا کوئی اور ہے جو ہمارے چھوٹے بڑے اختلافات سے فائدہ اٹھا رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم نے ملک کر اس فساد کو ختم کرنا ہے، ہم نے ایک ہو کر فسادات کا مقابلہ کرنا ہے اور ڈیرہ کو پر امن بنانا ہے"۔ میٹنگ کامیاب ہوگئی لوگوں کو رانیا کی بات سمجھ آ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے علاقے میں فسادات ہوں۔

رانیا نے گھر گھر جا کر لوگوں کو اکھٹا کیا آج ہر مسلک اور مذہب کے لوگ امن کی دوڑ میں رانیا کے ساتھ ہیں۔ رانیا اور اسکے ساتھیوں نے مل کر مثالحتی اور امن کمیٹیاں بنائیں جن میں مختلف مذاہب اور افکار کے عالم ہیں۔ پہلے اسکو لگتا تھا کہ اہل سنت اور اہل تشیع کو ایک ساتھ بیٹھانا بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن آج سب مسالک اور مذاہب کے علماء ساتھ بیٹھتے ہیں اور اپنا اپنا نقطہ نظر سامنے رکھتے ہیں ان میں سے اختلافات والی چیزوں کو الگ کر دیا جاتا ہے اور مشترکہ باتوں پر بات کی جاتی ہے۔

رانیا گھر سے نکلنے کی تیاری کرتے ہوئے بچوں سے باتیں کر رہی تھی۔ "بیٹا اسکول کا کام کر لو میں آج مصروف ہوں، آپکو پتہ ہے نا آپکی چھٹی ہو بھی جائے، لیکن میری چھٹی نہیں ہوتی۔ میں ابھی جا رہی ہوں پاس ہی ایک گاؤں ہے وہاں سے واپسی پر آپکے لیے چاکلیٹ اور جوس لے کر آؤں گی"۔ بچوں تو تسلی دیتی رانیا گھر سے نکلیں۔ آج اسکو ایک فورم کا انعقاد کروانا تھا۔ گاؤں پہنچ کر لوگوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی تو خوش ہوگئی۔ کبھی وہ وقت تھا جب رانیا لوگوں کو گھر گھر جا کر بلاتیں تھیں پھر بھی مشکل سے ۷ سے ۸ لوگ آتے تھے لیکن آج پچاس لوگ جمع تھے۔ اور اسکی ایک فون کال کرنے پر سب لوگ جمع ہو گئے تھے۔ رانیا نے بات کا آغاز کیا" آپ کو یاد ہے جب میں آپکے علاقے میں آئی تھی تو آپ لوگوں نے ایک دوسرے فرقے سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور وجہ جاننا چاہی تھی کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ علاقے میں امن کے لیے ہم ایک ساتھ بیٹھیں اور بات کریں؟ میں نے تب بھی یہ ہی کہا اور آج بھی کہتی ہوں کہ فرقہ واریت کی وجہ سے کاروبار کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ لوگ اپنا علاقہ چھوڑ کر ہجرت کر گئے ہیں، ہر گھر میں کسی نا کسی طور جانی و مالی نقصان ہوا ہے اس لیے مختلف مذاہب اور افکار کے اسکالرز کا ایک جگہ بیٹھ کر بات کرنا ضروری تھا۔ آج آپ لوگوں کے تعاون سے یہ ممکن ہوا ہے کہ ہمارے علاقے میں امن ہے شیعہ اہل سنت کے تہوار پر اور اہل سنت اہل تشیع کے تہوار پر انکے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں"۔ فارم پر باتیں ہوتیں رہیں اور رانیا دل ہی دل میں خوش تھی کہ آج جو باتیں ہو رہی ہیں آج سے تین ماہ پہلے ان کو لے کر فسادات ہو جاتے تھے اور آج بہت آرام سے ان مسائل کے حل پر سب مل کر بات کر رہے ہیں۔

رانیا کمیونٹی فورم سے گھر جا رہی تھیں کہ فون کال موصول ہوئی۔ "رانیا باجی جلدی سے ہمارے علاقے میں آجائیں بہت ایمرجنسی ہے" کال کرنے والی نے کہا۔ رانیا نے سوال کیا" رابعہ کیا ہوا ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"۔ دوسری جانب سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا کہ " آپکو تفصیل بتاتی ہوں آپ جلدی پہنچیں"۔ رانیا نے شوہر کو فون کر کے بتایا کہ وہ کسی کام سے جا رہی ہے دیر سے واپس آئے گی اور پھر رابعہ کے گھر پہنچ گئی۔ رابعہ نے بتایا "باجی لیاقت اپنی بیٹی کو ذبح کرنے والا تھا۔ سب لوگ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہمت کر کے لیاقت سے چھری چھینی اور لڑکی کو بچایا۔ پھر فون کر کے یہاں کی دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کو بلایا جن کو آپ نے تربیت دی تھی کہ کوئی غلط کام ہوتے دیکھو تو اسکو کیسے روکنا ہے۔ اگر آپ نے ہمیں ہمت نہ دلائی ہوتی اور قوانین کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو ہم بھی تماشا دیکھ رہے ہوتے"۔ رانیا نے کہا" تم لوگوں نے بہت ہمت سے کام کیا ہے میں اس لڑکی سے بات کرنا چاہتی ہوں پھر اسکے گھر والوں اور پولیس سے بات کر کے معاملے کو سلجھائیں گے۔ رانیا اپنی ٹیم کو لے کر معاملات کو سلجھانے کے لیے جا رہیں تھیں کہ ٹیم میں موجود ایک لڑکی نے کہا" ہم نے اس لڑکی کو تو بچا لیا ہے لیکن آپکو معلوم ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے؟" رانیا نے کہا" تم تو ہمارے ساتھ امن کے فروغ کے لیے کام کرتی ہو مجھے کیا معلوم تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں اگر تمہیں کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟" میرا

شوہر استری گرم کر کے مجھے لگاتا ہے۔ اگر ہم سے گھر میں یہ سلوک کیا جائے گا تو ہم امن، پیار محبت کی بات کیسے کر سکیں گے؟"۔ رانیا نے کہا" میں پہلے تمہارے شوہر سے ملوں گی پھر اس لڑکی کے گھر جاؤں گی۔ تم نے مجھے پہلے بتا دیا ہوتا تو میں پہلے آ جاتی"۔ وہاں سے رانیا دونوں گھروں کے مسائل حل کروا کر گھر پہنچی تو اسکے بچے اسکا انتظار کرتے سو گئے تھے۔ وہ ان سے وعدہ کر کے گئی تھی کہ واپسی پر ان کے لیے جوس اور چاکلیٹ لے کر آئیں گی۔ اس نے بچوں کے تکیے کے پاس چیزیں رکھیں اور سونے کے لیے چلی گئی۔

محرم کے دن نزدیک تھے رانیا نے صبح ایک ایسی یونین کونسل میں جانا تھا جہاں ۱۴ امام بارگاہیں ہیں ۔اس یونین کونسل میں سکیورٹی کے شدید انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ رانیا نے اپنی ٹیم کو فون کیا کہ کل وہ اپنی ٹیم کو بتائے گی کہ کون کیا ڈیوٹی کرے گا۔ سب تیار رہیں۔ سب مسالک اور مذاہب کے لوگ محرم کے دنوں میں مل کر ڈیوٹی کرتے ہیں۔ رانیا کو ان لوگوں کو متحد کرنے کے لیے ان کے درمیان فاصلے کم کرنے کے لیے خواتین کو ساتھ لے کر چلنا تھا اس لیے امن کی بات ہر گھر میں پھیلی خواتین امن کی کڑی کا حصہ ہیں۔ آج ایک ہزار سے زائد پیس کنیکٹرز ہیں جو امن کی بات کرتی ہیں۔ آج یہ ہی اہل سنت فقہ سے تعلق رکھنے والی خواتین مجالس میں بطور محافظ فرائض انجام دیتی ہیں۔

رانیا گھر میں بیٹھی بچوں کو اسکول کا کام کرواتی ہوئی اپنے شوہر سے باتیں کر رہی تھیں۔ اسکے شوہر نے کہا زندگی میں ہر قدم پر مشکلات آئیں گی لیکن میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ایک کامیاب عورت کا شوہر ہوں یہ ہی اللہ کا بہت بڑا کرم ہے۔ رانیا خوش ہیں کہ اس نے اپنے علاقے میں امن کے قیام کے لیے اپنے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ رانیا کا کہنا ہے کہ ان کی یہ کوششیں جاری رہیں گی۔

پہلا قدم میرا کیوں نہیں؟
عمارہ کی کہانی

عمارہ کچن کے دروازے میں سہمی ہوئی کھڑی تھیں جیسے بغاوت کا اعلان کر دیا ہو۔

عمارہ کا بھائی:" کل فارم لے آؤں گا۔ مجھے بتا دو کون سا مضمون رکھنا ہے؟"

حیرت کے مارے عمارہ کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ اتنی آسانی سے کالج جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ عمارہ بنوں میں اپنے والدین اور آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ پڑھنے اور اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا شوق ہے۔ ایجوکیشن مضمون رکھ کر استاد کے مقدس پیشے سے وابستہ ہونا چاہتیں تھیں۔

عمارہ نے انٹر پاس کر لیا ہے۔ عمارہ کی سہیلی گھر آئی اور اسکو بتایا" ایک غیر سرکاری ادارہ ہے اس میں نوکری کرنا شروع کر دو"۔ عمارہ نے کہا" وہ ادارہ نہ معلوم کیا کام کرتا ہے۔ ایسے میں تعلیم کے شعبے سے دور ہو جاؤں گی"۔ اسکی سہیلی نے بتایا" نوکری ایسی ہوگی کہ تمہیں اس میں تعلیم کے شعبے میں خدمات پیش کرنے کے مواقع ملیں گے"۔ سہیلی کے جانے کے بعد عمارہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی ماں سے بات کی کہ وہ باپ سے اجازت لے دیں۔ ماں نے کہا" تمہیں معلوم ہے نا کہ ہم کتنی مشکل سے گزارا کر رہے ہیں۔ تمہیں نوکری کا شوق پیدا ہو گیا ہے جبکہ ہم چاہتے ہیں تمہاری شادی کر دیں تا کہ اپنے فرض سے فارغ ہو جائیں"۔ عمارہ نے کہا" امی میں چاہتی ہوں آپ لوگوں کا سہارا بنوں۔ اپنے ملک کے لیے کچھ کروں۔ ہمارے بنوں میں بہت سی لڑکیاں تعلیم سے محروم ہیں، اگر میں بھی انٹر کر کے گھر بیٹھ جاؤں گی تو کیا فائدہ میرے تعلیم حاصل کرنے کا؟"۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا اور

عمارہ نے بھائی اور باپ سے اجازت لے لی۔لیکن طے یہ ہوا تھا کہ عمارہ کی خالہ ساتھ دفتر جایا کریں گی۔

بنوں میں بچیوں کی تعلیم پر خاص توجہ نہیں دی جاتی اور گھر سے باہر کام کرنا تو ایک مشکل مرحلہ ہے۔عمارہ نے لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے کام شروع کیا اور اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی۔عمارہ بنوں سے دور ایک گاؤں میں پڑھانے کے لیے گھر سے نکلیں۔اسکول پہنچی تو اسے معلوم ہوا ۹۹ فیصد لڑکیاں پڑھنے کے لیے موجود نہیں ہیں۔ کلاس لینے کے بعد عمارہ اساتذہ کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں بیٹھ کر ساتھی استاد سے بات کرنے لگیں۔" مجھے افسوس ہے کہ جس مقصد کے لیے یہاں آئی تھی وہ ہی پورا نہیں کر پاؤں گی"۔ساتھی استاد نے پوچھا" تمہارا ایسا کیا مقصد ہے؟"۔عمارہ نے کہا" میں چاہتی ہوں کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ کروں لیکن اسکول میں تو ایک فیصد سے بھی کم لڑکیاں ہیں"۔ساتھی استاد نے کہا" تمہیں معلوم ہے نا یہاں لڑکیوں کو تعلیم دلوانا اچھا نہیں سمجھا جاتا؟"۔عمارہ نے کہا میں اس سوچ کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔

اگلے دن عمارہ اسکول کی چند لڑکیوں کے ہمراہ علاقے کے لوگوں سے ملنے گئیں۔ایک گھر کی بیل بجائی۔خاتون باہر آئیں۔عمارہ نے بتایا" میں آپکے علاقے کے اسکول میں نئی استاد ہوں بنوں سے آئی ہوں۔ آپکی بیٹی کافی دن سے اسکول نہیں آ رہی۔میں وجہ جاننا چاہ رہی ہوں"۔دروازے پر کھڑی خاتون سے کہا" اسکی شادی ہوگئی ہے"۔اس سے پہلے کہ عمارہ مزید کوئی بات کرتیں دروازہ بند کیا جا چکا تھا۔عمارہ سمجھ گئیں یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوگا۔انہوں نے علاقے کے اثر و رسوخ رکھنے والے حضرات کو اپنے اعتماد میں لیا اور تعلیم کی

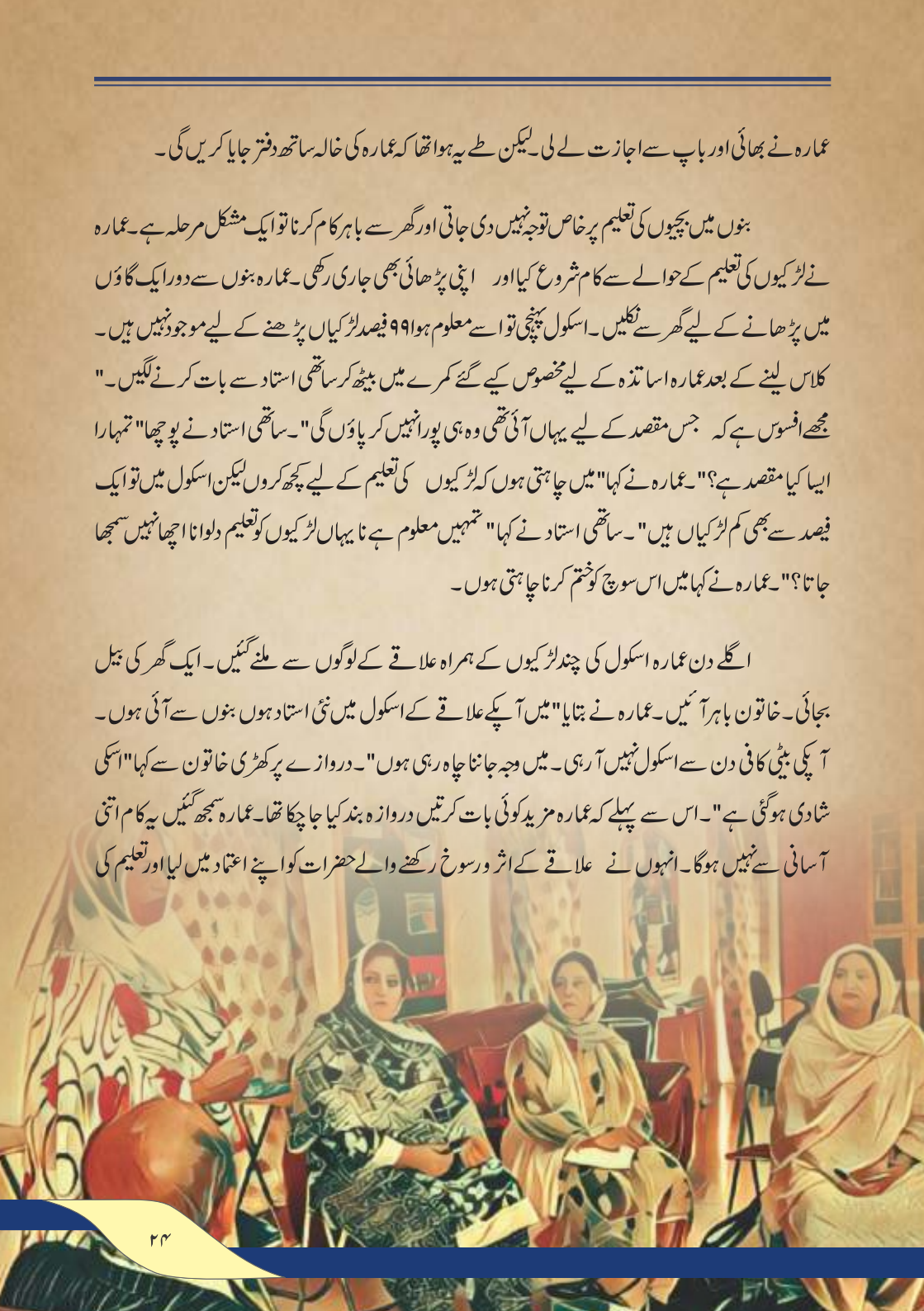

اہمیت سمجھائی۔ان حضرات نے لوگوں کو بتایا" ہمارے علاقے کی لڑکی ہے۔

استاد ہے غلط بات نہیں بتائے گی"۔آہستہ آہستہ لوگ عمارہ کی باتوں سے متفق ہونے لگے اور وہ تقریباً ۷ لڑکیوں کو اسکول داخل کرانے میں کامیاب ہوگئیں۔اسکول میں تفریح کے دوران عمارہ نے دیکھا گراؤنڈ میں بچیاں دائرے کی شکل میں ایک ساتھ جمع ہیں۔وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی انکے پاس پہنچیں۔دائرے کے درمیان میں ایک آٹھویں جماعت (اسکی ہی جماعت) کی طالبہ کیک کاٹتے ہوئے بہت خوش نظر آرہی تھی۔ لڑکیوں نے عمارہ کو دیکھا تو احتراماً سب چپ ہوگئیں۔عمارہ نے دوستانہ انداز میں دائرے کے درمیان کھڑی لڑکی سے پوچھا" آج تمہاری سالگرہ ہے؟"۔ابھی وہ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ دوسری لڑکی نے کہا" مس اسکی شادی ہورہی ہے یہ کل سے اسکول نہیں آئے گی"۔عمارہ حیرت میں تھیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے آٹھویں جماعت کی لڑکی کی شادی کروائی جارہی ہے۔وہ چپ کر کے پیچھے ہٹ گئیں۔

وہ سمجھ گئیں کہ بچیوں کی تعلیم کے بعد اب دوسرا کام اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں اور بچیوں کی شادی کے حوالے سے آگاہی فراہم کرنا ہے۔عمارہ گھر گھر جاتی اور لوگوں کو کم عمر میں شادی کے نقصانات اور قوانین کے بارے میں آگاہ کرتی۔طعنے سننے پڑتے ،لوگ سمجھتے تھے کہ وہ انکو ورغلا رہی ہیں۔محلے کے اثر ورسوخ رکھنے والے لوگوں کو ساتھ لے جا کر یہ کام شروع کر دیا۔لوگ آج یہ بات سمجھتے ہیں اور لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے بھی لوگوں کی سوچ تبدیل ہورہی ہے۔عمارہ سمجھتی ہیں کہ معاشرے میں تعلیم وآگاہی فراہم کر کے بنیادی مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔عمارہ کی کوششیں جاری رہیں گی اور اپنے علاقے میں موجود لڑکیوں کی تعلیم اور شادی کے حوالے سے مسائل حل کروانے کے لیے لوگوں کو اپنے قافلے میں شامل کرتی رہیں گی۔آپ بھی عمارہ کے ساتھ قدم سے قدم ملانا چاہتے ہیں تو سوچیں اور قدم بڑھائیں۔

کر بھلا، ہو بھلا
معوذ ارائیں کی کہانی

"معوذ تمہارا فون بج رہا ہے"۔ معوذ کی ماں نے آواز دی۔ معوذ کا فون کمرے میں پڑا تھا اور وہ دوست کے ساتھ گلی میں کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ماں کی آواز پر اندر آ کر فون اٹھایا نہ جانے دوسرے جانب سے کیا کہا گیا کہ وہ فون بند کر کے جلدی سے باہر کی جانب دوڑا۔ باہر کھڑے دوست کو موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کا کہا اور ہسپتال پہنچ کر جلدی جلدی قدم اٹھاتا ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ معوذ نے کہا" کتنا خون چاہئے؟"۔ اندر موجود شخص نے کہا" ایک بوتل مزید چاہئے"۔ معوذ نے کہا" اچھا چلیں میں خون دیتا ہوں"۔ معوذ یہ کام فی سبیل للہ کرتا ہے۔ خون دینے اور بیمار کی مدد کرنے فوراً پہنچ جاتا ہے۔ ابھی بھی یہ ہی ہوا تھا۔ فون پر اسکے دوست نے اسکو اطلاع دی کہ فلاں ہسپتال میں ایک شخص کو خون کی ضرورت ہے وہ نام، پتہ، مذہب، مسلک جانے بغیر خون دینے چلا آیا۔ صرف معوذ ہی نہیں بلکہ اس نے ایک ٹیم بنا رکھی تھی جو کہ لوگوں کی مدد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔

معوذ چار سال کا تھا جب اسکے والد جہان فانی سے رخصت ہو گئے اسکی والدہ استانی تھیں۔ معوذ نے بنیادی تعلیم کا آغاز ٹانک سے کیا اور ڈیرہ اسمائیل خان سے ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد ڈگری کالج سے کمپیوٹر میں گریجویٹ کیا۔ ایک دن معوذ اور اسکے دوست بیٹھے ہوٹل پر چائے پی رہے تھے کہ معوذ نے کہا" ابھی ہمارا رزلٹ آنے میں تھوڑا وقت ہے کیوں نہ تب تک خود سے کوئی کام شروع کریں"۔ دوست نے کہا" ہم کیا کام کریں گے اور کیسے کریں گے؟"۔ معوذ نے کہا" جیسے ہم لوگوں کی مدد کر رہے ہیں کبھی خون دے کر اور کبھی کچھ اور مدد کر کے کیوں نہ ایک تنظیم بنالی جائے۔ ایک نام ہو جائے گا جس کے جھنڈے کے نیچے ہم یہی کام جاری رکھیں گے۔ سب نے اسی پر اتفاق کیا اور انہوں نے ایک تنظیم بنالی"۔

معوذ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا خبریں دیکھ رہا تھا۔ "ایک نوجوان خودکش حملہ آور نے خود کو اڑا لیا آٹھ لوگ جان بحق ۱۵ زخمی ہوگئے ہیں"۔ دھماکہ کہاں ہوا، کیا نقصانات ہوئے ان سب سوچوں سے دور معوذ ایک ہی نقطے پر سوچ رہا تھا۔" کوئی نوجوان کیسے یہ سب کرسکتا ہے؟ کہیں اسکے پیچھے وجہ کم علمی، تعلیم کی کمی اور آگاہی کا نہ ہونا تو نہیں ہے؟" وہ سوچ رہا تھا اور صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اگلی صبح معوذ اپنی ٹیم کے ساتھ بیٹھا ہوا سب کے ذمے کام لگا رہا تھا۔ "بلال تم نے کمیونٹی کے ان بچوں کی فہرست تیار کرنی ہے جو تعلیم کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے۔ علی تم ایک پمفلٹ تیار کرو جس پر لکھا ہو کہ ہم بچوں کو مفت تعلیم دلائیں گے اس کے لیے ہمیں مخیّر حضرات کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کے پرنٹ نکال کر مسجد کے باہر کھڑے ہو کر نمازیوں میں بانٹو اور آصف کو کہو وہ بازار میں بھی بانٹ کر آئے"۔ معوذ کو لگتا تھا کہ دہشت گردی کی اہم وجہ شعور اور تعلیم کی کمی ہے جس کو عام کر کے دہشت گردی کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اگر ہم تعلیم سے آراستہ اور باشعور ہوں تو ہماری نوجوان نسل کو کوئی دہشت گردی میں ملوّث نہیں کرسکتا۔

ابھی چند ہی بچوں کو اسکول داخل کروایا تھا کہ اسکول فیس دینے کے لیے جانے والی ٹیم کو معلوم ہوا کہ جس بچوں کی تعلیم کے اخراجات وہ اٹھا رہے ہیں ان میں سے ایک بچہ اسکول نہیں آ رہا۔ ٹیم نے معوذ کو بتایا کہ ایسے تو ہماری محنت رائیگاں جائے گی۔ معوذ بچے کے گھر گیا اور اسکے والدین سے بات کی" آپکا بچہ اسکول نہیں جا رہا ہم نے مختلف یونین کونسل میں کمیٹیاں بنا کر تعلیم کے حصول میں آنے والی رکاوٹوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے

اگر آپ لوگ تعاون نہیں کریں گے تو مسائل ویسے کے ویسے رہیں گے"۔ بچے کے والد نے کہا" ہمارا بچہ میڈیکل اسٹور پر کام کرتا ہے، اگر کام نہیں کرے گا تو پیسے کیسے آئیں گے"۔ معوذ نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ سوچا اور پھر کہا" کیا یہ ہوسکتا ہے کہ اگر میں میڈیکل اسٹور والے سے بات کرلوں، آپکا بچہ شام کو میڈیکل اسٹور چلا جائے اور صبح اسکول چلا جائے تو آپکو کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا"؟۔ بچے کے والد نے کہا" نہیں مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا"۔ معوذ نے بچے سے کہا" کیا ایسا ممکن ہے کہ تم اسکول اور میڈیکل اسٹور کو ٹائم دے سکو"؟ بچے نے کہا" مجھے بہت خوشی ہوگی اور میں پڑھائی کے لیے خود وقت نکال لوں گا"۔ معوذ بچے کو ساتھ لے کر میڈیکل اسٹور والے سے بات کرنے کے لیے چلا گیا۔

میڈیکل اسٹور پر بچے کے کام کے اوقات کار کے بارے میں بات کرنے کر بعد اس نے بچے کو واپس بھیج دیا اور مالک سے کہا" میں نے آپ سے ایک درخواست کی تھی کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں"؟۔ مالک نے کہا " آپ نیک کام کر رہے ہیں بالکل ہم کم قیمت میں آپکو ضرورت مندوں کے لیے ادویات فراہم کریں گے"۔ معوذ نے کہا" آپکو معلوم ہوگا کہ ایمرجنسی کی صورت میں عموما اکن کن ادویات کی ضرورت ہوتی ہے"۔ میڈیکل اسٹور کے مالک نے کہا" ہمیں معلومات تو ہے لیکن اس سلسلے میں آپ ڈاکٹر سے بھی لکھوا کے رکھ لیں تاکہ ہم وہ ادویات آپکو دے دیں تاکہ آپکے پاس ایمرجنسی کے لیے محفوظ ہوں"۔ معوذ شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے واپس آ گیا۔

معوذ لوگوں کو مالی مدد فراہم کرنے اور انکے مشکل وقت میں کام آنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس نے چند لوگوں سے بات کر رکھی ہے وہ اسکو اسکول بنانے کے لیے زمین دیں گے لیکن اسکول قائم کرنے کے لیے پیسے اور دیگر وسائل درکار ہیں۔ اسکول قائم کرنے کے خواب کی تعبیر کرنے میں کچھ وقت لگے۔ اسکے اسکول میں غریب بچے مفت تعلیم حاصل کر سکیں گے لیکن اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے تگ و دو جاری ہے۔ اگر باقی لوگ بھی معوذ کی طرح اپنے اردگرد موجود مسائل کے حل کے لیے کام کرنے لگیں تو بہت سے مسائل بگاڑ کی صورتحال پیدا ہونے سے پہلے حل ہو جائیں۔

زمین سے رشتہ نبھا رہے ہیں
ہارون سربدیال کی کہانی

سردیوں کی دوپہر سورج کی نرم دھوپ جسم کو سکون دے رہی تھی۔ بچے کو دھوپ میں چارپائی پر لٹا کر بیوی شوہر سے متوجہ ہوئی۔ "ہمارا بیٹا دو دن کا ہو گیا ہے اسکا نام نہیں رکھا"۔ اس سے پہلے کہ شوہر کوئی جواب دیتا دروازے پر بیل بجی۔ شوہر دروازہ کھول کر داڑھی والے شخص کو ساتھ لیکر اندر داخل ہوا۔ بیوی احتراماً کھڑی ہو گئیں۔ آنے والے شخص نے مٹھائی اور مبارک دی۔ شوہر نے کہا "شاہ صاحب ہم سوچ رہے تھے کہ اسکا نام رکھیں کیا آپ اسکا کوئی نام تجویز کریں گے؟"

شاہ صاحب: "ہارون۔۔۔۔۔اسکا نام ہارون رکھو"

بچے کا نام ہارون رکھا گیا۔ گھر والوں نے اسکا اپنے مذہب (ہندو مذہب) کے مطابق بھی ایک نام رکھا۔ معاشرے میں یہ بچہ ہارون سربدیال کے نام سے جانا جانے لگا۔ دن بیتتے گئے اور ہارون اسکول جانے لگا۔ پشاور کے فیڈرل گورنمنٹ اسکول میں ہارون کا داخلہ ہوا۔

اسکول میں اسلامیات کا پیریڈ ہے۔ استاد صاحب سب بچوں سے سبق سن رہے ہیں۔ "ہارون سربدیال کھڑے ہو جاؤ اور سبق سناؤ"۔ ہارون نے فرفر سبق سنایا اور شاباش لینے کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہارون ہندو ہے لیکن وہ جہاں رہتا ہے وہاں ہر مذہب اور فرقے کے لوگ رہتے ہیں، یہ ہی وجہ ہے کہ اسکو زندگی نے مذہبی ہم آہنگی اور پیار محبت کے ماحول میں پروان چڑھنے کا موقع بخشا۔ کبھی کہیں سے آواز آتی۔۔۔۔

"ہارون چلو میں مجلس میں جا رہی ہوں میرے ساتھ چلو"۔ "اچھا فریدہ باجی" کہتا ہارون گھر والوں سے اجازت لینے چلا جاتا۔ کوئی کہتا "میں مسجد جا رہا ہوں چلو گے؟" وہ ساتھ چل پڑتا مسجد میں جا کر مسجد کی صفائی کرتا اور عربی سیکھتا۔ گردوارہ، مندر اور چرچ۔۔۔ مسجد ہو یا امامبارگاہ ہارون کہیں بھی جانے سے نہ گھبراتا۔

آج جمعہ ہے اور اسکول سے چھٹی ہے ہارون شاہ صاحب سے ٹیوشن پڑھنے جا رہا ہے۔ "شاہ صاحب آپکو معلوم ہے ہماری نویں کلاس میں اب اور بھی زیادہ عربی اور آیات کا ترجمہ ہو گیا ہے" ہارون نے شاہ صاحب کو بتایا۔ شاہ صاحب نے جاننا چاہا" کیا تمہیں مشکل لگ رہا ہے اسلامیات پڑھنا؟"۔ "ہارون نے مسکرا کر جواب دیا" نہیں! مجھے تو اچھا لگتا ہے کہ میں وہ ہی سب پڑھوں جو سب پڑھتے ہیں۔ بلکہ میں بھی آپ ہی کی طرح اسلامیات پڑھانا چاہتا ہوں"۔ شاہ صاحب نے مسکرا کر کتابیں نکالنے کو کہا اور ہارون کو پڑھانے میں مصروف ہو گئے۔

ہارون گھر واپس آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نہ جانے ماں لوگوں کے گھروں میں کام کر کے واپس آئی ہوگی یا نہیں۔ گھر میں آج کھانے کو کچھ ہوگا یا بھوکا سونا پڑے گا۔ گھر پہنچ کر اس نے دیکھا ماں گھر موجود تھی اور دستر خوان پر اسکا انتظار ہو رہا تھا۔ اس نے بستہ رکھا اور ہاتھ دھو کر بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ کھانے میں آج بھی سوکھی روٹی کا حلوہ بنا تھا۔ کھانے کے دوران ہارون نے باپ سے پوچھا "ابا جان میرے میٹرک کرنے کا خرچہ کون اٹھائے گا؟"۔ باپ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ماں نے کہا "میں جس گھر میں کام کرتی ہوں وہاں بات کی ہے انہوں نے کہا ہے وہ تعلیم کے اخراجات اٹھائیں گے"۔ ہارون کی بہن نے پوچھا "میری تعلیم کا کیا ہوگا؟" باپ نے اسکے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا "میں نے ایک جگہ مزدوری کی ہے انہوں نے ہامی بھری ہے کہ

تمہاری فیس دیں گے"۔سب کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔

ہارون سربدیال کالج کے کمرے میں ہاتھ میں رجسٹر اور کتاب لیے داخل ہوتے ہیں۔کلاس میں پہنچ کر طلبہ سے پوچھا"اسلامیات کے ٹیسٹ کی تیاری ہے؟ میں چاہتا ہوں بیچلرز میں میری کلاس کے سب سے اچھے نمبر آئیں"۔وہ بچہ جس کے ہمسایوں نے اسکو اسلامیات پڑھانے اور عربی پڑھنے میں مدد کی تھی آج اسلامیات کا استاد ہے۔ٹیسٹ لینے کے بعد ہارون کلاس سے باہر نکل کر پرنسپل کے دفتر کی جانب بڑھے۔

پرنسپل صاحبنے بٹھنے کا کہا اور پوچھا"ہارون خیریت ہے تم جلدی کیوں جانا چاہتے ہو؟"ہارون نے وجہ بتائی: میں نے کورٹ میں ایک کیس کیا ہے ہمارے مذہب (ہندو مذہب) کے بارے میں چند غلط باتیں نصاب کا حصہ ہیں اس حوالے سے کورٹ جانا ہوگا"۔پرنسپل صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا"تم خوب کام کر رہے ہو اسلامیات بھی پڑھا رہے ہو اور اپنے مذہب کے بارے میں بھی لوگوں کی غلط فہمی دور کر رہے ہو"۔ہارون اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

ہارون اسلامیات پڑھانے کے ساتھ اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے بھی کافی کام کر رہے ہیں۔ چرچ میں تمام مذاہب کے لوگ موجود ہیں۔ہارون نے کہنا شروع کیا۔"ہم حکومت سے گلہ شکوہ کرتے ہیں کیونکہ حکومت ہماری ماں ہے۔ہم ماں سے اپنی پریشانیاں بیان کرتے ہیں تاکہ انکو حل کیا جا سکے۔جب تک ہم مل کر اپنے مسائل کی نشاندہی نہیں کریں گے یہ مسائل حل نہیں ہو سکتے اس لیے بطور ایک ذمہ دار شہری اور سماجی کارکن میں ان مسائل کی حل کے لیے نہ صرف آواز اٹھا رہا ہوں بلکہ میری یہ کوشش ہے کہ ان مسائل کو جلد از جلد حل کیا جائے"۔سامنے بیٹھے لوگوں میں سے کسی نے کہا آپ اکیلے کیا کیا کر رہے ہیں؟ ہارون نے کہا"امن کے فروغ کے لیے ہم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے بلکہ ہمارے ساتھ بسنے والے اگر ہماری بطور ایک انسان کے مدد کریں اور ہمارا ساتھ دیں تو ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے۔کہ معاشرے میں امن قائم ہو۔جیسے کہ خیبر پختونخواہ کے دارلخلافہ پشاور، ڈی آئی خان، ہنگو اور بنوں میں شمشان گھاٹ نہیں ہے جب تک ہم اپنی ضرورت کے بارے میں نہیں بتائیں گے اور

مختص کیے گئے بجٹ کے بارے میں سوال نہیں کریں گے تب تک یہ مسائل حل نہیں ہوں گے۔اسی لیے میں سوال کرتا رہوں گا"۔

اگلے دن پشاور میں ایک مدرسے کی انتظامیہ سے ہارون صاحب کی بات ہو رہی تھی ۔ ہارون وہاں پڑھنے والے بچوں کو مندر میں بلانا چاہتے ہیں۔مدرسے کی انتظامیہ پہلے تھوڑی تذبذب کا شکار تھی بالآخر حامی بھر لی۔ہارون نے انکا شکریہ ادا کیا اور اپنے مدارس کے ساتھ کیے گئے کام کے حوالے سے بتانا شروع کیا"ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں اور ہنگو کے مسلمان بھائی ہمیں دفنانے کے لیئے جگہ دیتے ہیں یہ اللہ کا شکر ہے مشترکہ طور پر دفنانے دیتے ہیں ۔ یہ ایک بہترین مثال ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں کیونکہ ہمارے درمیان بھائی چارہ قائم ہے۔اس بھائی چارے کو قائم رکھنے کے لیے ہم اپنی ذمہ داری بھی ادا کرتے رہتے ہیں اور مختلف فورم پر مل کر بیٹھتے ہیں اور مذاہب اور مسالک کی تفریق سے ہٹ کر ایک دوسرے کے مسائل حل کروانے کے لیے مل کر کام کرتے ہیں"۔مدرسے کی انتظامیہ سے ایک شخص: "ہم امن کے فروغ میں آپکے ساتھ ہیں" ہارون نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مزید بتایا" کل ہی میں بنوں سے واپس آیا ہوں ۔ہم نے ڈیرہ اسماعیل خان ،بنوں،ہنگو کے مدارس میں بھی سیشن منعقد کروائے ہیں جہاں ہم نے مدارس کے طلبہ کو اپنے مذہب کے بارے میں بتایا اور امن کے فروغ کے لیے مل کر کام کرنے کی یقین دہانی کروائی ہے"۔

آج نیشنل ووٹرز ڈے ہے اور ہارون ایک سیشن میں کہہ رہے ہیں "ہم جمہوری ملک کے باسی ہیں، اس لیے ووٹ دینے کی آزادی سے تب تک لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک ہمارے نمائندے بھی ووٹ کی بنیاد پر نہ چنے جائیں۔" ہارون نیشنل لوبنگ ڈیلیگیشن فار مائینوریٹی رائیٹس پاکستان، ایڈوائزری کمیٹی پروموشن پروٹیکشن انفورسمینٹ آف ہیومن رائٹس، اور لاء منسٹری گورنمنٹ آف خیبر پختونخواہ کا ممبر ہونے کے ناطے ہر فورم پر امن کی بات کرتے ہیں۔انکا کہنا ہے کہ "ہم مذہبی ہم آہنگی کے فروغ کے لیئے تمام مذاہب اور مسالک کو ایک

دوسرے کے قریب لانے کے لیئے کوششیں کر رہے ہیں۔اس حوالے سے حکومت بھی مواقعے فراہم کرتی ہے مثال کے طور پر ۷۰ لاکھ مذہبی ہم آہنگی اور تہواروں کے مختص کیے گئے تا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ قریب آسکیں جس سے پاکستان اندرونی خطرات سے محفوظ ہو سکے گا۔

رقم مختص ہونا کافی نہیں ہے کیونکہ آج بھی قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران کو دی جانے والی رقم کرپشن کی نظر ہو جاتی ہے۔اس لیے ذمہ دار شہری کے طور پر ہم سوال کرتے رہتے ہیں تا کہ کام مکمل ہو سکے"

پشاور میں عید میلا دالنبی ﷺ کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہے۔ ہارون نے تیاریاں کروائیں اور خیر کی دعائیں مانگیں۔کانفرنس کے لیے دعوت نامے لکھ کر ای میل کیے جا رہے ہیں۔ ہارون نے اپنے بچوں سے پوسٹ کیے جانے والے دعوت ناموں پر نام لکھوائے۔ یہ پہلی میلا دالنبی ﷺ کانفرنس ہے جو کہ پشاور میں ایک ہندو کمیونٹی کی جانب سے منعقد کروائی جا رہی ہے۔ ہارون کے کاموں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا کیونکہ مختلف مسالک اور مذاہب کے لیے اور انکے ساتھ کام کرنا ہارون کا شوق ہے۔ ہارون کی آج کی میٹنگ ہائیر ایجوکیشن کمشن کے چیئر مین کے ساتھ ہے۔ ہارون نے کہا کہ ہمارے لوگوں کو تب تک نوکریاں نہیں مل سکتیں جب تک کہ وہ تعلیم میں آگے نہ جائیں ان کے لیے مناسب تعلیم کا انتظام ہونا ضروری ہے۔آپ کے لوگ اس لیے آگے نہیں جاتے کیونکہ ان کی تیاری نہیں ہوتی ہم آپکو یقین دہانی کرواتے ہیں کہ ہائر ایجوکیشن کمشن کو چنگ کے اخراجات اٹھائے گا تا کہ ہندو کمیونٹی کی تیاری کرائی جا سکے"۔ہائیر ایجوکیشن کمشن کے چیئر مین کی جانب سے کروائی گئی یقین دہانی کے بعد ہارون صاحب اگلی میٹنگ کے لیے چلے گئے۔

کمیونٹی کی میٹنگ میں ہارون نے بہت سے لوگوں کو مدعو کر رکھا ہے۔"میں چاہتا ہوں کہ آپکو ان لوگوں سے ملواؤں جن کو ہم نے اپنی ٹیم میں شامل کیا اور یہ لوگ آج امن کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ سارہ ہیں جن کا چہرہ تیزاب سے جھلس گیا تھا۔اس کے بعد جب وہ ہمارے پاس آئیں تو ہم نے ان کو کہا کہ بجائے اسکے کہ تم دل شکستہ ہو جاؤ ہمت کرو اور ان لوگوں کے لیے کام کرو جو اسی کرب سے گزر رہے ہیں۔گائیتی جو

کہ بیوہ ہوگئیں ہیں وہ بیواؤں کوان کے حقوق دلوانے کے لیے کام کرتی ہیں۔اسی طرح آج اس محفل میں تمام وہ لوگ ہیں جو جس کرب سے گزرے باقیوں کو اسی سے بچانے کے لیے امید کی کرن ہیں"۔ ہارون کے ان کاموں کا سلسلہ جاری ہے وہ اپنی اور دیگر کمیونٹی کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔انہوں نے نوجوانوں، عورتوں اور بچوں کو امن کے فروغ کے لیے ایسے کاموں میں مصروف کر رکھا ہے کہ وہ کسی غلط اور منفی کام کی جانب جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

میرے ارادے: میری پہچان

فرید سنگھ کی کہانی

آپ نے آج پھر دیر کر دی، سب انتظار کر رہے ہونگے جلدی جلدی قدم اٹھائیں فجر کی اذانیں بھی ہو رہی ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ میرے والد میرا ہاتھ تھامے تیز تیز چلے جا رہے ہیں مساجد سے اللہ اکبر اللہ اکبر کیا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اور میرے خاندان والے پگڑی پہنے مندر میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں ایک عرصے تک یہی سمجھتا رہا کہ اذان ہماری عبادت کیلئے شروع ہوتی ہے کیوں کہ محمد علی کہتا تھا کہ حی علی الفلاح مطلب ہے آؤ کامیابی کی طرف اور بابا کہتے عبادت میں کامیابی ہے جب کبھی کسی ہم مکتب نے جاننا چاہا کہ ہماری عبادت کا وقت کیا ہے تو میں یہی کہ دیا کرتا تھا کہ جاتے ہم مندر میں ہیں، مگر اذان کے بعد، مندر سے مراد من کا در ہے اور گرو کا در وہ گردوارا ہوتا ہے میرے لیئے مندر اور گردوارا ایک ہی حیثیت کا حامل رہا ہے۔

پریم نگر ہنگو میں فجر کی اذانوں کی گونج کے ساتھ ہم سب جاگ کر گرو دیو مہاراج کے نعرے لگاتے ہوئے ایک دھڑے پر پہنچتے تھے، اور وہاں مسجد سے نکلنے والا محمد علی اور میں گلے ملتے تھے ہمارا گھرانہ ایک سیاسی گھرانہ تھا بابا سب سے ملتے تھے اور شہر کے تمام حالات پر گفتگو ہوتی ملک کی بقا و بہتری کی باتیں ہوتیں اس کے

بعد ہم سب اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوجاتے بابا کہتے تھے کہ پڑوسیوں کا خیال رکھنا ہماری اولین عبادت وذمہ داری ہے اور ہمارے پڑوسی ہمارے بھائیوں جیسے تھے۔

ایک دن اچانک خبر آتی ہے کہ ہندوستان میں چند شر پسند عناصر نے مسجد کو شہید کیا ہے مسلمانوں میں ایک شدید غصہ کی لہر تھی۔لیکن یہ غصہ یہاں پر بسنے والوں پر نکالا جارہا تھا جو بے قصور تھے مختلف شہروں میں مندروں پر پتھراؤ کیا گیا ۔ہنگو میں کچھ نہیں ہوا بلکہ لوگ ہمارے شانہ بشانہ آ کر کھڑے ہوئے ہمسائیوں کے حقوق بھرپور طریقے سے ادا کیے۔تب اندازہ ہوا مسلمان مذہب کی تفریق سے بالاتر ہوکر ہمارے ساتھ ہیں اس میں سرفہرست میرا دوست محمد علی اور انکے بابا تھے یہ تربیت ہمارے خاندان میں سب کو دی گئی زمین سب کی ہے مذہب اپنا اپنا۔ کبھی بھی مذہب ہمارے آپسی رشتے میں دخل نا دے سکا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہنگو کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں پر محیط ہے لیکن خدمت کرنے کا موقع ہمیں بھی دیا جاتا ہے کہ میرے والد محترم ممبر قومی اسمبلی رہ چکے ہیں۔اور مجھے بھی بارہا یہی موقع ملتا رہا کہ امن کا پیغام عام کرتے رہیں۔

ایسے واقعات بھی دیکھنے کو ملے کہ جب ہم امن کا پیغام لے کر نکلے تو کہا گیا کہ، یہ کون ہیں۔اور انکا ہم سے کوئی تعلق نہیں تب بھی ہنگو کے لوگ ہماری آواز بنے اور ہمارے ساتھ کھڑے رہے یہ زمین ہمارے آباؤ اجداد کی میراث ہے جسے ہم نے سنبھالنا ہے اور اس خطے کو سنوارنا ہے۔جب مجھے امن کمیٹی کا ممبر بنایا جارہا تھا تب احساس ہورہا تھا کہ جو پاکستان کے جھنڈے میں موجود سفید رنگ کو اہمیت ہمیں مل رہی ہے۔پہلی بار ایسا ہوا کہ اس میں اقلیتوں کو جگہ دی گئی اور انہیں ممبر بنایا گیا ہے۔اس میں سکھ، ہندو، عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس دن ایک فیصلہ ہورہا تھا تو انہوں نے کہا نا تم حل کرو نا ہم حل کرتے ہیں یہ تیسرے فریق ہیں یہ حل کریں گے وہ مسلمانوں کا مسئلہ تھا ایک جسکو ہمیں حل کرنے کا موقع دے کر ہماری حوصلہ افزائی کی گئی اور اب لوگ سمجھنے لگ گئے ہیں یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔

ناکردہ گناہ معاف

رادیش سنگھ ٹونی کی کہانی

کیا عید مسلمانوں کا تہوار تھا؟

یقین جانیے مجھے ایک طویل عرصے بعد علم ہوا کیونکہ عید پر سویاں تو ہمارے گھر بھی آتیں تھیں۔ بچپن میں ساتھ کھیلتے تھے سکول کے بڑے طالب علم ہمارے بڑے بھائی تھے محلے کے تمام بڑے ہمارے بڑے ہوتے تھے۔ جو شفقت جو محبت والد صاحب سے ملی وہی گلی کے چاچا اسلم سے ملی جب بھی باہر دیکھ لیتے تو شفقت بھری ایک ڈانٹ کے ساتھ ہاتھ تھامے گھر چھوڑ کے چلے جاتے تھے۔ بابا کی بھی داڑھی تھی اور چاچا اسلم کی بھی مجھے ہمیشہ ان میں والد صاحب کی شفقت نظر آتی تھی۔ اسکول میں اساتذہ کی تربیت بھی ایک جیسی تھی۔ جیسا سلوک میرے دوست حسین کے ساتھ ہوتا ویسا میرے ساتھ ہوتا کسی کے بھی برتاؤ میں کبھی کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا تم سکھ ہو وہ مسلمان ہے وہ تمہیں اپنا بھائی نہیں سمجھتے میں نے اسکی بات پر دھیان نہ دیا۔ میں حسین کے گھر داخل ہوا اور امی سے کہا بھوک لگی ہے کھانا دے دیں حسین کی امی میری بھی تو امی تھیں۔ بچپن سے حسین میرے گھر آتا تھا اور ساتھ ساتھ رہتا تھا میں بھی اکثر انکے گھر چلا جاتا تھا۔ عید پر ہم ان کے گھر جاتے اور گرودیو مہاراج کے جنم دن وہ ہمارے گھر آتے تھے۔ میرا اتنا حسین بچپن پشاور میں ہی گزرا لیکن کوئی مانتا ہی نہیں کہ سب کچھ اتنا اچھا تھا، میں فٹبال بہت اچھی کھیلتا تھا ہر کھیل میں اچھا تھا کبھی کبھی تو محلے ٹیم سے حسین کو نکال کر مجھے کھلایا جاتا تھا۔

میں فٹبال کھیلنے گراؤنڈ گیا لیکن آج نا جانے کوئی مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا۔ اکثر میرے گراونڈ میں داخل ہوتے ہی سب کہتے آج رادیش ہماری طرف سے کھیلے گا۔ اقبال کو ٹیم میں لے لیا اسکو فٹبال بھی نہیں آتی لیکن اسکو کھلا رہے ہیں۔ حسین بھی سیدھے منہ بات نہیں کر رہا۔ حسین کی ناراضگی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ۔میں اسکے پاس گیا اور کہا تم میری جگہ کھیل لینا لیکن مجھ سے ناراض مت ہو مجھے یقین نا آیا حسین نے میری جانب دیکھا بھی نہیں اور مجھے نظر انداز کرتا آگے چلا گیا۔ یہ وہی حسین ہے جو میرے ساتھ کھانا کھاتا تھا؟ میں خود کو یقین نہیں دلا پا رہا تھا۔ میں سب سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن مجھے کہا گیا کہ تم لوگوں نے ہندوستان میں مسجد شھید کی ہے۔

میں خود سے سوال کرتا رہا کہ میں کیسے مسجد شھید کرنے کا قصوروار ہوں؟

میرے لیئے مسجد اور گردوارا ایک جیسے ہی تھے کیونکہ حسین کی عبادت گاہ مسجد تھی۔ میری گردوارا تھی۔ میرے لیئے مسجد بہت محترم ہے۔ میں کیسا کر سکتا ہوں؟ خود سے سوال کرتا آنسو بہاتا گھر کی جانب دوڑتا چلا گیا۔ گھر پہنچ کر امی کی گود میں سر رکھا اور کہا حسین کہتا ہے "میں نے مسجد شھید کی ہے امی میں کیسے کر سکتا ہوں ۔ میں حسین کی عبادت گاہ کو کیسے گرا سکتا ہوں یہ سب مجھ سے بات نہیں کرتے"۔ میں اس غم میں تھا اور دعا کرتا رہا کے میرے دوست دوبارہ میرے دوست ہو جائیں۔

کوئی میرا ساتھ نہیں دے رہا اب میں بھی بات نہیں کرونگا۔ حسین کے گھر عید پر بھی نہیں جاؤں گا چاہے کتنا بھی وہ منانے آئے یہ سب میں من ہی من دہرا رہا تھا۔ سامنے دیکھتا ہوں حسین اور اسکے والد میری گھر کی جانب آرہے ہیں اور میرا دل حسین کے میرے گھر کی جانب بڑھتے قدم میرے دل کو نرم کر رہے تھے۔ اور اچانک الیاس چاچا آئے اور کہا "حسین تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے اور تم نے بابری مسجد بلکل شھید نہیں کی"۔ میری آنکھوں سے آنسوں نکل پڑے اور میں اور حسین گلے مل کے رونے لگے اور حسین میرا ہاتھ پکڑ مجھے کھینچتا ہوا گراؤنڈ میں لے گیا۔ مجھے پھر ٹیم کا حصہ بنایا گیا اور پھر قائداعظم ٹرافی بھی کھیلی فٹبال میں واپڈا کی نمائندگی بھی کی

لیکن اب ہم بڑے ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں شہید ہونے والی مسجد والی بات میرے ذہن پر عیاں ہونے لگی۔ جو نفرت مجھے بچپن میں اس گراؤنڈ میں دیکھنے کو ملی تھی اب مجھے ہر موڑ پر دکھائی دینے لگی۔ مجھے کہا گیا تم لوگ اقلیت میں ہو ہم مسلمان نہیں اسی وجہ سے آگے مجھے نہیں کھلایا جائے گا۔

حسین بچپن گزر گیا اور جوانی میں قدم رکھا میری طاقت میرے دوست ہی رہے۔ کھیل کے میدان سے لے کر عملی میدان تک مجھے پشاور نے محبت دی۔ جو میرے دوست نہ تھے ان کے کچھ کہنے یا نہ کہنے سے میری شخصیت میں کبھی تبدیلی نا آئی۔ پھر ایک شب نے میری ذات کو جھنجھوڑ دیا۔ میرا شہر سسکیاں لے رہا تھا۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کی شب میرے ملک پر بڑی بھاری گزری بچے بوڑھے بے یارو مددگار کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے تھے۔ میں ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا تھا کہ لوگ ان کے لیئے استعمال شدہ چیزیں جمع کر رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا میں نے بھی اک چھوٹا سا کیمپ لگایا جہاں میں ان کے لیئے نئے کپڑے اور بستر اور کھانے پینے کا سامان اکھٹا کرنے لگا اور اس کام کے لیئے لوگوں کے یقین نے میرے حوصلے بلند کر دیئے۔ سب سے زیادہ سامان میرے کیمپ میں اکھٹا کیا گیا اور لوگوں تک پہنچایا گیا۔ اس کام کے لیے مقامی لوگوں نے مجھے "امن کا سفیر" کا خطاب دیا۔ میرے نزدیک آج بھی انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے۔

اپنی کمیونٹی کے حوالے سے بھی مجھ پر کچھ ذمہ داریاں عائد کی گئی اور میں انہیں خوش اصلوبی سے نبھانے کی کوشش کرتا ہوں، میرے نزدیک ہم سب پہلے انسان ہیں۔ میرے خیال سے گردوارے کے چار دروازے اسی لیے ہوتے ہیں کہ تمام مذاہب کے لوگ آ سکتے ہیں۔ گرو نانک جی نے کہا تھا "اول اللہ پایا قدرت کے سب بندے، ایک نور تے سب جگ اپجیا کون بھلے کون مندے"۔ یعنی کہ "ایک نور سے سب پیدا ہوئے ہیں کوئی برا نہیں"۔

میری ہمت: میرے ساتھی

حضرت گل کی کہانی

میری اس شروعات کے پس منظر میرے گھر والے اور میرے دوست ہی تھے کہ جب میں ہمت ہار جاتا تب وہ میری طاقت اور ہمت بنتے اور اسی کاوش سے میں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ماسٹرز مکمل کیا۔ ایسے بھی کئی مقامات آئے جہاں میری تکلیف سے صرف میرا رب واقف تھا۔ میں اسلامیہ کالج میں پہلا طالب علم تھا جو معذوری کے بعد بھی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لوگ ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کرتے تھے جو میرے پست حوصلوں کو بلند کرتی اور مجھے مزید آگے بڑھنے کے لیے آمادہ کرتی تھی۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا کہ آخر میرے ساتھ کیوں ایسا ہوا لیکن رفتا رفتا معذوری میں میں صلاحیت تلاش کرنے لگا۔ میرا واسطہ ان لوگوں سے بھی پڑا جو ذہنی معذور تھے، وہ نا تو جسمانی معذوروں کا ساتھ دینے کو تیار تھے نا ہی انکی حوصلہ افزائی کرنے پہ آمادہ تھے۔

تب یہی خیال آتا کہ حضرت گل تمہیں ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا ہے کیونکہ میری کامیابی میں جس طرح میرے گھر والوں سے لیکر میرے دوست احباب کی رہنمائی شامل ہے اسی طرح ان لوگوں کی ناکامی میں انہی لوگوں کا ہاتھ شامل تھا اور ان کے لیے کسی کو آواز اٹھانی تھی۔ پڑوسی چاچا کہا کرتے تھے بیٹا رب اپنے بندوں کی خدمت کے لیے خاص لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ میں تو ماں کی لوری میں بھی سنتا آیا ہوں کہ میں خاص ہوں۔ اللہ کے بندوں کی خدمت میرے حصے میں ہی آئی اور میں نے اپنے جیسے خاص افراد کے لیے ایک ادارہ بنایا اور ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتا رہا میں نے پریس کلب کے سامنے اور بنی گالا پہنچ کر ان کو صحت کارڈ دلوائے تا کہ یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۷۸ء کو دو آبہ ہنگو کی پرامن فضاؤں میں آنکھ کھولنے والا حضرت گل ہمارے معاشرے کا اہم اور ایک خاص فرد ہے۔

میری اس شروعات کے پس منظر میرے گھر والے اور میرے دوست ہی تھے کہ جب میں ہمت ہار جاتا تب وہ میری طاقت اور ہمت بنتے اور اسی کاوش سے میں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ماسٹرز مکمل کیا۔ ایسے بھی کئی مقامات آئے جہاں میری تکلیف سے صرف میرا رب واقف تھا۔ میں اسلامیہ کالج میں پہلا طالب علم تھا جو معذوری کے بعد بھی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لوگ ہر موڑ پر میری حوصلہ افزائی کرتے تھے جو میرے پست حوصلوں کو بلند کرتی اور مجھے مزید آگے بڑھنے کے لیے آمادہ کرتی تھی۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا کہ آخر میرے ساتھ کیوں ایسا ہوا لیکن رفتا رفتا معذوری میں میں صلاحیت تلاش کرنے لگا۔ میرا واسطہ ان لوگوں سے بھی پڑا جو ذہنی معذور تھے، وہ نا تو جسمانی معذوروں کا ساتھ دینے کو تیار تھے نا ہی انکی حوصلہ افزائی کرنے پہ آمادہ تھے۔

تب یہی خیال آتا کہ حضرت گل تمہیں ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا ہے کیونکہ میری کامیابی میں جس طرح میرے گھر والوں سے لیکر میرے دوست احباب کی رہنمائی شامل ہے اسی طرح ان لوگوں کی ناکامی میں انہی لوگوں کا ہاتھ شامل تھا اور ان کے لیے کسی کو آواز اٹھانی تھی۔ پڑوسی چاچا کہا کرتے تھے بیٹا رب اپنے بندوں کی خدمت کے لیے خاص لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ میں تو ماں کی لوری میں بھی سنتا آیا ہوں کہ میں خاص ہوں۔ اللہ کے بندوں کی خدمت میرے حصے میں ہی آئی اور میں نے اپنے جیسے خاص افراد کے لیے ایک ادارہ بنایا اور ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھاتا رہا میں نے پریس کلب کے سامنے اور بنی گالا پہنچ کر ان کو صحت کارڈ دلوائے تا کہ یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۷۸ء کو دو آبہ ہنگو کی پرامن فضاؤں میں آنکھ کھولنے والا حضرت گل ہمارے معاشرے کا اہم اور ایک خاص فرد ہے۔

خودی

سلیم فرانسس کی کہانی

نوین جماعت کا طالب علم بغل میں کتابیں دبا کر اسکول جا رہا ہے۔ پیدل چلتے چلتے راستے میں دو دوست مل گئے۔ تھوڑی دیر دوستوں نے راستے میں کھڑے ہو کر کوئی بات کی اور پھر تینوں دوست اسکول سے متضاد سمت چل پڑے۔ یعنی کہ اسکول سے کہیں اور جانے کا ارادہ بن گیا تھا لیکن کہاں؟ کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ تبھی اسکول میں آدھا وقت گزرنے جانے کر بعد پرنسپل صاحب اس نویں جماعت کے طالب علم کے گھر پہنچ گئے۔ سلیم کہاں ہے؟ سلیم کی والدہ نے کہا وہ تو اسکول گیا ہے۔ پرنسپل صاحب نے کہا میں آپکو بتانے آیا ہوں کہ وہ اسکول نہیں آیا تھا اور آج میں نے اسکو اور اسکے دوستوں کو نمائش سے پکڑا ہے اور سزا دی ہے، مجھے اجازت دیں میں چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر پرنسپل صاحب آگے بڑھ گئے لیکن کچھ پریشان تھے۔ کیونکہ لڑکے کی ماں کو تسلی دینے کے لیے انہوں نے کہا تھا کہ میں نے انکو پکڑا ہے اور سزا دی ہے جبکہ ان لڑکوں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وہاں سے پرنسپل صاحب تھانے کی جانب چل پڑے لیکن راستے میں ہی تینوں لڑکے مل گئے۔ اسکے بعد انکے ساتھ کیا ہوا یہ سب جانتے ہیں کیونکہ ہم سب نے ہی کبھی نا کبھی شرارت کرنے پر اساتذہ سے ڈانٹ کھائی ہوگی۔ اگر کسی نے نہیں کھائی تو انکے لیے یہ راز ہی رہنے دیں۔

سلیم کو پڑھنے سے لگاؤ تھا لیکن کبھی کبھار فلم دیکھنے یا دریا پر سیر کرنے کے لیے دوستوں کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ سلیم کو احساس تھا کہ والد مشکل سے پڑھائی کے اخراجات اٹھا رہے ہیں۔ وہ بڑا ہوتا جاتا ذمہ دار ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی پڑھائی کے بعد پیدل چل کر دور دراز علاقوں میں ٹیوشن پڑھانے جاتا۔ سلیم کی زندگی کا مقصد نا خواندگی کو کم کرنا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد انکے پرنسپل نے انکے کالج کی فیس ادا کر کے انکو پڑھایا۔ سلیم صاحب

خوش قسمت تھے اس لیے تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی سرکاری نوکری بھی مل گئی۔علم کی لگن ختم نہ ہوئی وہ بھی جاری رہی اور ترقی کی منازل بھی طے کرتے رہے۔ایک دن سلیم صاحب کمیونٹی کی ایک میٹنگ میں بیٹھے تھے کسی نے اپنے کسی ذاتی مسئلے کی جانب نشاندہی کروائی اور کہا کہ کوئی مدد کردے سلیم صاحب کھڑے ہوگئے اور کہا" ہم تین دوست ہیں جو ایسے کام کرتے رہتے ہیں، ہماری کوشش ہے کہ ان لوگوں کی بھی مدد کی جائے جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔میرے خیال میں تعلیم اور شعور دو بنیادی مسائل ہیں جن کے حل کے لیے کام کرنا نہایت ضروری ہے۔ہم بطور شہری بھی ان مسائل کے حل کے لیے کوشش کر سکتے ہیں اس لیے میں سمجھتا ہوں میرے پاس موقع ہے کہ میں آگاہی اور شعور کے لیے کام کروں۔ہماری کمیونٹی کی خواندگی کی شرح بہت کم ہے اور معاشی طور پر بھی مستحکم نہیں ہیں۔ہم ان کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے لوگوں کی ترقی سے کام کا آغاز کیا تا کہ وہ ملک کی ترقی میں کوئی اہم کردار ادا کر سکیں"۔کمیونٹی کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان لوگوں کے لیے کام کر رہا ہے۔اسکے بعد کوئی بھی کام ہوتا سلیم کے گھر کا دروازہ کٹھکھٹایا جاتا۔

سلیم صاحب یاد ہے جب آپ نے جہلم کی دو لڑکیوں کا مسئلہ سلجھانے میں مدد کی تھی؟ سلیم صاحب کے جاننے والے ان کے ساتھ بیٹھے ماضی کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔سلیم صاحب نے کہا ہاں مجھے یاد ہے، تبھی تو آج تک ہم ایسے ہی لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔ساتھ بیٹھے تیسرے شخص نے سوال کیا سلیم صاحب مجھے بھی بتائیں وہ کیا مسئلہ تھا؟۔سلیم صاحب نے بتانا شروع کیا سالوں پرانی بات ہے کہ "دو لڑکیاں جہلم سے ایک لڑکے کے ساتھ کوئٹہ آگئیں تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی اور دوسری اس ڈر سے ساتھ آگئی کہ میں اسکے ساتھ کالج آتی جاتی ہوں اگر اب میں اکیلی گھر جاؤں گی تو گھر والوں کو کیا کہوں گی کہ دوست کہاں گئی۔لڑکے نے لڑکیوں کو اپنے بہنوئی کے گھر کوئٹہ میں رکھا۔لڑکے کے بہنوئی نے وہاں کے چوہدری کو دونوں لڑکیاں حوالے کر دیں کہ انکا فیصلہ کریں۔لڑکا پریشان تھا کہ میری جس لڑکی سے شادی ہونی ہے چوہدری صاحب اس لڑکی کا فیصلہ بھی نہیں کر رہے اور دونوں لڑکیوں کے لیے روز کچہری لگائی جاتی تھی۔لڑکے کا بہنوئی میرے پاس آیا اور اس نے کہا مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے میں نے لڑکیاں چوہدری صاحب کے حوالے کی ہیں، اب انکا

فیصلہ نہیں ہو رہا۔ میں چوہدری صاحب کے گھر گیا لیکن چوہدری صاحب نے لڑکیاں حوالے نہیں کیں۔ پھر میں وہاں سے تھانے چلا گیا، سارا قصہ اسٹیشن ہاؤس آفیسر کو سنایا۔ تھانے میں معاملات طے ہوئے اور لڑکیاں میرے حوالے کر دیں گئیں۔ سلیم صاحب نے ان لڑکیوں کو دارالامان میں نہ رکھا بلکہ انکو کانونٹ میں نن کے ساتھ ٹھہرا دیا۔ چند دن بعد لڑکیوں کا فیصلہ کروایا اور ایک لڑکی کی لڑکے سے شادی کروائی اور دوسری کو راضی نامہ کروا کر اسکے گھر واپس بھیجا۔ ایسے مسائل کی روک تھام اور انکے حل کے لیے ہم نے ایک جماعت بنائی تھی تا کہ جو کام ہم کر رہے تھے انکو ایک چھتری کے نیچے کیا جا سکے۔

سلیم صاحب ایک سیمینار میں بطور اسپیکر مدعو کیے گئے تھے۔ انہوں نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگوں کے رویوں اور عمل میں تبدیلی آئے جو کہ تعلیم اور شعور کے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ہم کیا تعلیم دے رہے ہیں۔ کیونکہ ایک بہت بڑے نجی اسکول جسکی شاخیں پورے ملک میں ہیں اسکی کتاب میں عیسائیت کے بارے میں جو لکھا گیا وہ غلط ہے۔ میں نے اس پر کیس کر رکھا ہے امید ہے کہ ہم نصاب سے غلط باتیں خارج کروا کر امن کی جانب بڑھ سکیں گے"۔ انہوں نے مزید کہا "میں نے بہت سیشن کروائے ہیں جن میں ہم نے لوگوں کو شعور دینے کا کام کیا ہے۔ ووٹ کی اہمیت کے متعلق بتایا تا کہ لوگ اپنا ووٹ ضائع نہ کریں اور اسکا درست استعمال کر سکیں۔ کیونکہ ہم ایک جمہوری ملک میں رہتے ہیں اس لیے ملک کی جمہور کو جمہوریت کے ثمرات اسی صورت مل سکتے ہیں جب انکو معلوم ہو کہ جمہوریت سے ایک عام انسان کو کیا فائدہ ہے۔ اسی لیے ہم نے جمہوریت کی تاریخ پر سیشن اور سیمینار منعقد کروائے۔ اس ملک سے امن وسکون ختم ہو جاتا ہے جہاں انصاف نہ ہو اور اگر ہم انصاف کو گھر سے شروع کرنے کا درس دیں گے تو زندگی آسان ہو جائے گی ہم نے بھی یہ ہی کیا لوگوں کو گھر سے انصاف کرنے کا درس دیا۔ ملک میں بدامنی اور دہشتگردی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے حقوق پامال ہوئے ان کے کیسز خود کورٹ میں لے جاتے تھے اور فیس بھی ادا کرتے رہے ہیں تا کہ انکے حقوق انکو مل سکیں"۔ سلیم صاحب کا کام یہاں ختم نہیں ہوا وہ اپنے لوگوں کے لیے کام کر رہے ہیں بلکہ انکا کہنا ہے کہ جتنے زیادہ لوگ ہمارا ساتھ دینا چاہیں ضرور دیں کیونکہ ہم ملک کی فلاح کے لیے کام کر رہے ہیں اپنی زندگی سنوارنے کے لیے تو سبھی کام کرتے ہیں۔

کامیابی کا گیت

سنیل کمار کی کہانی

سنیل کمار کی دادی بھیک مانگتی تھیں اور دادا بوٹ پالش کرتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنے بیٹے کو پڑھایا۔ سنیل کمار کے والد بوٹ بھی پالش کرتے، پڑھاتے بھی تھے اور ۸۰۰ روپے پر نوکری بھی کرتے تھے۔ استاد تھے، عطر بھی بیچتے تھے۔ سنیل کمار بھی جب اسکول جانے لگا تو صبح کے وقت اسکول جاتا اور شام میں کھیل کے دوران اسکو جو بچے ملتے تھے انکو گھر کی چھت پر بنے جھونپڑی کے اسکول میں پڑھنے کے لیے رضامند کرتا تا کہ وہ بچے بھی کچھ سیکھ سکیں۔ ایک روز انکے جھونپڑی اسکول میں کسی ادارے کے لوگ آئے اور کہا کہ وہ بچے شام کو کھیل اور دیگر تفریحی سرگرمیوں کے لیے انکے پاس آجایا کریں۔ یہ بچے بہت خوش تھے انکو کچھ نیا سیکھنے کو بھی مل جاتا تھا اور تفریح بھی ہو جاتی تھی۔ سنیل کمار صبح اسکول جاتا، اسکول سے واپس آتا تو بوٹ پالش اور گاڑیاں صاف کرنے والے بچوں کو لے کر اسکول میں جمع ہوتے جسکی بنیاد اسکے والد نے ڈالی تھی۔ اسکے بعد وہ مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن وہ ایک ادارہ تھا جو انکو کسی نہ کسی سرگرمی میں مصروف رکھتا ایک دن وہ ادارہ ختم ہو گیا۔ سنیل کمار اور اسکے چند دوستوں نے تھیٹر کرنے اور چند دیگر طریقوں سے لوگوں تک اپنا پیغام فن کے ذریعے پہنچانا سیکھ لیا تھا۔

سنیل کمار نے سوچا کہ جن بچوں کو اس نے شوق سے جمع کیا تھا اب ان کے لیے مشاغل کا راستہ بھی بند ہو گیا ہے وہ سارا دن کام کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں آخر ایسا کیا کیا جائے کہ انکے لیے تفریح کا سامان ہوتا رہے۔ سنیل نے جن بچوں کو جمع کر کے ٹیم بنائی تھی انکو پڑھانے کے بعد رکنے کا کہا" آپ سب بچوں کو معلوم ہے کہ ہم جس ادارے کے ساتھ کام کرتے تھے وہ بند ہو گیا ہے۔ لیکن اب ہم اسکو خود سے جاری رکھیں گے۔ کیا تم لوگ

میرے ساتھ ہو؟"۔سب بچوں نے خوشی سے با آواز بلند کہا"ہاں ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔پھر ہم آج ابھی پریکٹس کرتے ہیں، ہم تھیٹر پرفارم کریں گے۔شانتی نگر کے بیرونی دروازے کے پاس شام ۵ بجے ہم تعلیم کی اہمیت پر تھیٹر کریں گے۔اسکے بعد سنیل سب بچوں کو تیاری کروانے میں مصروف ہوگیا۔

شام کو سب بچوں نے شانتی نگر کے بیرونی دروازے کے پاس تھیٹر پرفارم کیا اور خوب رش لگایا۔لوگوں نے پسند کیا اور بچوں کو شاباش دی۔ابھی وہ تھیٹر پرفام کر کے واپس جانے ہی والے تھے کہ انکے علاقے کے ایک صاحب آئے اور پوچھا"میرا بیٹا رادیش تم لوگوں کے ساتھ ہے؟"۔سنیل نے کہا" نہیں وہ ہمارے ساتھ نہیں ہے، کیا ہوا ہے"۔ان صاحب نے کہا وہ بوٹ پالش کرنے گیا تھا لیکن اب تک واپس نہیں آیا اب تو شام ہوگئی ہے مجھے پریشانی ہونے لگی ہے"۔سنیل نے دو بچوں کو انکے گھر بھیجا کہ شاید جتنی دیر وہ باتیں کر رہے تھے بچہ گھر واپس آ گیا ہو اور خود ان صاحب کے ساتھ بچے کو ڈھونڈنے چلا گیا۔جہاں پر بچے عام طور پر بوٹ پالش کرنے جایا کرتے تھے سب جگہیں چھان ماریں۔جب تھیک ہار کر واپس آ رہے تھے تو انکو فٹ پاتھ پر ایک بچہ بے ہوش حالت مین نظر آیا وہ اسکی جانب بڑھے۔یہ رادیش تھا وہ اسکو ہسپتال لے گئے۔

اگلے دن سنیل نے کہا کہ کل کے رادیش کے ساتھ ہونے والے افسوسناک واقعے کے بعد اب وہ بچوں کے ساتھ ہونے والی جنسی زیادتی کے حوالے سے تھیٹر پرفارم کریں گے۔تھیٹر کی تیاریاں ہونے لگیں اور تھیٹر کرنے کے لیے انہوں نے شہر کے میں اشاروں کے پاس جگہیں منتخب کیں تھیں۔تھیٹر کر رہے تھے تو ہجوم میں سے ایک شخص آیا اور سنیل سے کہا" کیا تم ہمارے لیے بھی تھیٹر کرو گے؟"۔سنیل نے کہا"ضرور کریں گے"۔سنیل کی ٹیم مختلف اداروں کے ساتھ صحت، تعلیم اور جنسی زیادتی پر تھیٹر کرنے لگے۔ایک دن ادارے کے لوگوں نے تھیٹر کے لیے صبح کا وقت مقرر کیا۔سنیل کی ٹیم میں تمام بچے بوٹ پالش کرنے، عطر بیچنے، رکشہ چلانے اور گاڑیاں صاف کرنے والے تھے۔اگر وہ صبح روزی کمانے نہ جاتے تو گھر والے انکو تھیٹر کرنے کی اجازت بھی نہ دیتے۔سنیل نے سبکو کہا" آج ہمیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا، تم سب اپنا اپنا کام کا سامان ساتھ لے آنا ہم وہاں سے ہی کام پر چلے جائیں

گے"۔سب بچوں نے ایسا ہی کیا اپنا سامان سائیڈ پر رکھا اور تھیٹر پر فارم کیا اسکے بعد سنیل نے میزبان ادارے کے لوگوں کو کہا" ہم بچے یہاں اپنا روزگار چھوڑ کر آئے ہیں لیکن آج کے بعد سے ہمارے لیے کچھ رقم مختص کی جائے تو مناسب ہوگا"۔ادارے کے لوگوں نے کہا" دو سو روپے ہم فی بچہ ہر پرفارمنس پر دیں گے کیا تم لوگوں کو منظور ہے"؟۔سب بچے خوش ہوگئے انکے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔

مختلف طریقوں سے وہ اکٹھے ہونے اور خوش رہنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے۔سنیل اور اسکی ٹیم نے سوچا کہ مختلف کمیونٹیز کے لوگوں سے کیسے میل جول بڑھایا جائے۔اپنی کمیونٹی کے بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا،تعلیم کی اہمیت پر بات کرنا،تھیٹر کرنا سے بات آگے بڑھی،اب ضرورت تھی کہ مختلف کمیونٹیز کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔"ایسا کیا کام ہوسکتا ہے جو ہم مختلف کمیونٹیز کے ساتھ مل کر کریں گے"؟سنیل کی ٹیم اس سوال کا جواب تلاش کرنے لگی۔پھر انہیں جواب مل گیا،کیوں نہ ہم کوئی فٹبال کا میچ کروائیں؟۔یہ طے ہوگیا کہ فٹبال کا میچ ہوگا۔مسلم کمیونٹی کے ساتھ بات کی گئی کہ وہ بھی اپنی ٹیم بنائیں اور میچ کھیلا جائے۔وہ لوگ جو ایک ہی علاقے مین رہتے تھے انہیں قریب لانے کا اور ایک دوسرے کو جاننے کا موقع ملا اور ایسے سنیل کی ٹیم ٹورنامنٹ جیت گئی۔

یہ سب وہ کام تھے جو سنیل اور اسکی ٹیم معاشرے میں بہتری کے لیے کر رہی تھی۔لیکن انکی کاوشیں یہاں تک محدود نہیں تھیں بلکہ سنیل کے والد نے جو کام شروع کیا تھا جس میں اپنے علاقے کے بچوں کو اسکول داخل کروانا شامل تھا سنیل نے بھی وہی کام جاری رکھا۔تھیٹر کے ذریعے بچوں اور انکے والدین کو تعلیم کی اہمیت بتائی جاتی،انکو اسکول جانے کے لیے رضامند کیا جاتا اور اسکول میں داخل کروایا جاتا تھا۔لیکن چند ماہ ہی وہ بچے اسکول جاتے اور اسکے بعد پھر اسکول چھوڑ دیتے۔لیکن سنیل نے اپنا کام جاری رکھا۔سنیل نے اپنی ٹیم کو ایک ادارے کی شکل دے دی تھی جس میں ہر نسل،مسلک اور مذہب سے تعلق رکھنے والے نوجوان تھے۔سنیل کا کہنا ہے کہ "ہماری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کے آج اسی چوک پر جہاں ہم سب بوٹ پالش کرنے،گھروں میں کام کرنے،گاڑیاں صاف کرنے جاتے تھے آج اسی چوک پر تمام بچے اسکول جانے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔سنیل کی ٹیم کی کوششوں سے آج یہ بچے اسکول جانے لگے ہیں۔سنیل کا یہ ماننا ہے کہ ہم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک تعلیم نہ حاصل کریں۔تعلیم ہی کی بدولت ہم مناسب روزگار حاصل کر سکیں گے۔"

رازِ حیات

ثناء اللہ کی کہانی

میرے دوست اسکول کا بستہ لیئے اسکول کی جانب رواں دواں ہیں۔ روزانہ سب صبح اسکول جاتے ہیں اور شام میں میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔ آج کھیلتے ہوئے اچانک اسلم نے کہا" آؤ ڈاکٹر انجینئر والا کھیل کھیلتے ہیں۔ "میں ڈاکٹر بنوں گا، اکرم انجینئر اور ثناء اللہ تم کیا بنو گے "؟۔ "میں کیا بنوگا؟" ثناء اللہ اسی سوچ میں گم رہا۔ اس دن میں ان کے ساتھ نہ کھیل سکا، اس دن احساس ہوا کہ یہ سب پڑھ لکھ کر بڑے افسر بن جائیں گے۔ "میں کیا کرونگا"؟۔ میرے اندر انہی سوالات کی جنگ شروع ہوگئی۔ میں شام کا انتظار کرنے لگا کہ کب بابا آئینگے اور میں آج ان سے کہوں گا مجھے بھی اسکول جانا ہے۔ پڑھ لکھ کے بڑا افسر بننا ہے۔ میں ایسی زندگی نہیں چاہتا جو گھر کی چار دیواری میں گزر جائے۔ جیسے ہی دروازہ کھٹکا میں دروازے کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ بابا کے گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے کہا مجھے اسکول جانا ہے۔

بابا میری بے جان ٹانگوں کی جانب دیکھنے لگے۔ انہوں نے آنکھوں میں نمی لیئے میرے سر پر دست شفقت رکھا اور کہا" کیوں نہیں میرا بیٹا پڑھے گا۔ یہ سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا۔ اگلے دن سے میں اسکول جانے لگا بابا میرے لیئے ٹرائی سائیکل لے آئے۔ آج میرا اسکول کا پہلا دن ہے۔ میرے تمام دوست اسکول پہنچ چکے ہیں۔ مجھے ایک گھنٹے سے زیادہ گزر چکا ہے میں ابھی تک رستے میں ہوں۔ سڑک کے بیچ میں یہ ایک موڑ پر ٹرائی سائیکل کو زور لگانا پڑیگا۔ "مجھ سے نہیں ہو پائے گا، لیکن میرے خواب؟ ان کا کیا ہوگا؟ مجھے یہ موڑ سر کرنا پڑیگا ۔ مجھے بھی ڈاکٹر انجینئر والا کھیل کھیلنا ہے۔ آج شام میں ہی ڈاکٹر بنوں گا اسلم کو بننے نہیں دونگا بس وہ موڑ میں سر کر گیا"۔

میں دو گھنٹے بعد اسکول پہنچ گیا۔تمام اساتذہ اور دوست میری جانب داد بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔میں نے شاید آج کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہاں میں بنوں کا پہلا لڑکا ہوں جو ٹرائی سائیکل پر اسکول آیا ہوں۔ میں نے ابتدائی تعلیم اسی ٹرائی سائیکل اور دوستوں گھر والوں اور اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور داد کی بدولت مکمل کر لی۔اب آگے پڑھنا ہے میں نے پانچویں تک تعلیم حاصل کر لی ہے اب مڈل اسکول جانا ہے۔وہ اسکول بہت دور ہے لیکن میں جاؤں گا اب راستے میں دو موڑ آتے ہیں لیکن میں انہیں پار کرتا ہوں شدید گرمیاں ہیں میں پسینے میں شرابور ہو کر اسکول پہنچتا ہوں۔

میں نے ۲۰۱۰ء میں بنّو کے پوسٹ گریجویٹ کالج میں داخلہ لیا۔اب میں اپنی اسپیشل موٹر سائیکل میں سوار ہو کر جاتا ہوں۔میں نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا اور اب بنّو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کر رہا ہوں ۔جس دن میں نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا اس دن گھر کی جانب لوٹ رہا تھا تو راستے میں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کے دونوں پاؤں میں جان نہ تھی۔میں اسکے قریب گیا اور پوچھا کیا تم بھی بچپن سے ایسے ہو تو کہنے لگا کہ نہیں یاد ہے پچھلے سال یہاں اک زوردار دھماکا ہوا تھا اس میں میرے دونوں پاؤں ضائع ہو گئے۔مجھے تکلیف ہو رہی تھی کہ مجھے تو پتا ہی نہ تھا کہ دونوں پاؤں پر کھڑے ہو کر چلنا کیسا ہوتا ہے۔لیکن یہ تو دونوں پاؤں پر چلتا تھا اور آج اس ویل چیئر پر ہے۔اس دن میں نے ٹھان لی کہ ایسے لوگوں کے لیے میں امید بنوں گا اور میں نے "امید" کے نام سے ایک ادارہ بنایا ہے۔

بچپن سے معذوری کا شکار ہونے والوں کی ہمت اور حوصلہ افزائی کی تا کہ لئے جو تکالیف اور صعوبتیں میں نے برداشت کیں ہیں وہ کوئی اور نا کرے۔یہ میری زندگی کا اولین مقصد ان تمام لوگوں کے دلوں میں امید جگا نا ہے جو کہ کسے معذوری کے باعث نا امید ہو چکے ہیں۔اسلم جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے اس کے گھر کے باہر کافی بھیڑ تھی۔معلوم ہوا کہ اسلم خودکشی کرنا چاہتا تھا۔موقع پر اسکو بچا لیا گیا۔وجہ دریافت کی تو کہنے لگا" یونیورسٹی میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے اس قدر نا امید اور غمزدہ ہو گیا ہوں کہ اپنی بیسا کھیاں جلا دیں اور اپنے آپ کو ختم کرنا

چاہتا ہو"۔ میں اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور کہا" کیا معذور بیٹے کی موت پر مائیں آنسوں نہیں بہاتی ؟ بہنیں غم سے نڈھال نہیں ہوتی ؟ اس کے دوست کیا اسکی یادوں وعدوں کو آرام سے بھلا دیتے ہیں"؟۔ اسلم کہنے لگا نہیں اور گلے لگ گیا کہ آئندہ ایسا نہیں کرونگا لیکن ثناء اللہ میں اکیلا بہت تھک چکا ہوں۔ میں نے کہا تم اکیلے نہیں میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اسکو حق کے لیے لڑنے کی امید دلائی، تسلی دی، بیساکھیاں نئی دلائیں اور یونیورسٹی میں داخلہ بھی کروادیا۔ مجھے کہیں جا کر خوشی نظر آئی اسکے رخساروں پر یہ کامیابی اور خوشی مجھ میں کہیں پہلے ہی کھل کھلا رہی تھی۔

جب میں نے جاننا چاہا کہ ایسے کتنے اسلم اپنی زندگیوں سے ناخوش ہیں تو معلوم ہوا کہ اس وقت بنّوں میں تقریباً ۳۸۰۰ معذور افراد ہیں۔ تو میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک چکی تھی۔ معذوری کی سب سے بڑی وجہ انسانی انتشار سے جنم لینے والی لڑائیاں اور خودکش حملے ہیں۔ مجھے اسکا کوئی حل نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ میں جانتا تھا نا ہی اب یہ ۳۸۰۰ افراد نہ کسی کھیل کے میدان میں جانے کے قابل رہے ہونگے نا ہی معذور افراد کا کوٹہ ہونے کے باوجود انہیں کسی ادارے میں نوکری نہیں دی جائے گی۔ اب یہ ۳۸۰۰ سے مزید اضافہ نہ ہو اسکے لیے کوئی حل چاہتا تھا اس پہ قابو پانے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ سمجھ آرہا تھا کہ لوگوں تک معذور افراد کی آواز پہنچائیں ان میں شعور بیدار کریں تا کہ وہ جان سکیں کہ پیدائشی طور پر معذور ہونا یا کسی حادثے کا شکار ہو کر معذور ہونا کتنا تکلیف دہ ہے۔ یہی سوچا ان تمام لوگوں سے ملاقات کی اور ان سے اجازت لے کر ان پر ایک چھوٹی فلم بنائی گئی جس میں انکی حادثے سے پہلے کی زندگی اور حادثے کے بعد کی زندگی کو مکمل طور پر بیان کیا گیا۔ کمیونٹی میں موجود لوگوں کے سامنے اسکو ایک پروگرام میں پیش کیا گیا کہ اگر اب بھی پر امن نہیں ہوئے تو اب انسان نہیں معاشرہ معذور ہو جائے گا۔ جسمانی معذوری سے زیادہ بھیانک ذہنی معذوری ہے جس کا شکار ہم اس وقت ہیں۔ براہ کرم ہوش کے ناخن لیں اور ایک پر امن معاشرہ تخلیق دیں۔ یہ ایک ثناء اللہ ہے جس کی داستان آپ تک پہنچائی ہے ایسے کئی ثناء اللہ ہیں جن کی تلاش کرنی ہے اور انکی کاوششوں کو سراہنا ہے۔

ادارے سے آگاہی

انڈوبجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش درج شدہ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔ اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔ انڈوبجوئل لینڈ ابتدا سے ہی نوجوانوں کی ترقی اور امن کے فروغ کے لیے مصروف عمل رہا ہے۔ امن کے فروغ کے لیے ہمارا ادارہ واضح طور پر قانون دانوں، نوجوانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کرتا ہے۔ خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

انڈیویجوئل لینڈ کی نوجوانوں سے متعلق مزید اشاعت

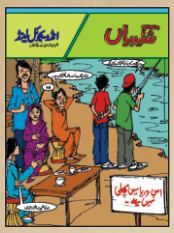

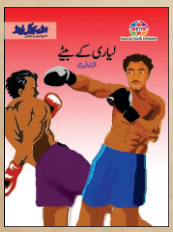

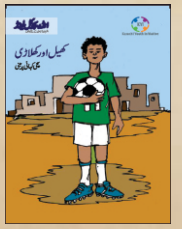

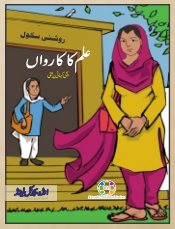

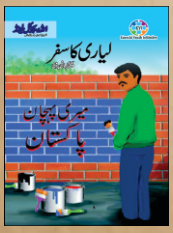

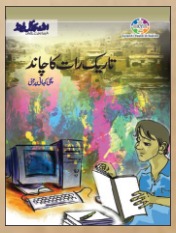

Contact us
info@individualland.com

individualland

individualland

www.individualland.com